سرمایہ دارانہ اشتراکی نظام
کا
اسلامی معاشی نظام سے موازنہ

از افادات

شیخ الاسلام حضرت علامہ شمس الحق افغانی

مکتبۃ الحسن

۲۹/۹ لال چوک عبد الکریم روڈ قلعہ گوجر سنگھ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرمایہ دارانہ و اشتراکی نظام

کا

اسلامی معاشی نظام سے موازنہ

از افادات

شیخ الاسلام والتفسیر محقق العصر حضرت علامہ شمس الحق افغانی دامت برکاتہم

مکتبۃ الحسن ۲۹/۹ لال چوک عبدالکریم روڈ
قلعہ گوجر سنگھ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طبع سوم

نام کتاب ——— سرمایہ دارانہ و اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ

مؤلفہ ——— شیخ الاسلام حضرت علامہ شمس الحق افغانی

منتظم اعلیٰ ——— ڈاکٹر عبدالرشید مخدومی

ناشر ——— مکتبہ الحسن ۹/۲۹ لال چوک عبدالکریم روڈ قلعہ گوجر سنگھ لاہور

مطبع ——— نامی پریس لاہور

ضخامت ——— ۲۰۴ صفحات

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— پندرہ روپے

فہرست مضامین

سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ

حصہ دوم کیمونزم
از صفحہ ۴۲ تا صفحہ ۸۹

حصہ سوم اسلامی اعتدالی نظام
از صفحہ ۹۰ تا صفحہ ۱۳۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیّد المرسلین محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ امّا بعد۔

مال و دولت کو جمع کرنے کی اندھی خواہش نے آج دنیا میں تباہی اور فساد مچا رکھا ہے، اصل بات یہ ہے کہ اگر دولت کی مہار مذہب کے ہاتھ میں نہ ہو تو پھر ایسی دولت عیاشی اور فحاشی کا ایک خطرناک سیلاب بن جاتی ہے۔ جس میں اخلاق، شرافت، تہذیب سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ یہی کچھ یورپ میں ہوا، کہ دولت کی فراوانی نے انھیں بدمست، بدکردار اور مذہب سے متنفر بنا دیا، مذہب تو انصاف، رحم، غریب پروری کی تعلیم دیتا ہے۔ جب کہ بلند بانگ دعوے کرنے والا یورپ اِن صفات سے عاری ہے۔

اسلام دولت کی محبت کے بجائے انسانوں سے محبت کا سبق دیتا ہے۔ اسلام دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے خلاف ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ دولت جمع نہ کرو، بلکہ مستحقوں میں تقسیم کرتے رہو۔ اسی تقسیم کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں کچھ علاقہ کے لوگ اتنے آسودہ حال ہو گئے تھے کہ ان میں کوئی بھی صدقات مستحق نہ رہا تھا۔

آج بھی اگر دینی تعلیم کے مطابق دولت کو جمع نہ ہونے دیا جائے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد تُؤۡخَذُ مِنۡ اَغۡنِیَاءِ ھِمۡ وَ

تُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِھِمْ (مال داروں سے دولت لے کر ان ہی کے فقراء بھائیوں میں تقسیم کر دی جائے) کے مطابق مستحقین میں بانٹنے کا انتظام ہو جائے تو تمام معاشی ناانصافیاں ختم ہو جائیں گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام اللہ رب العالمین کا وہ تجویز کردہ نظام ہے جو عالمی امن کا ضامن اور اولادِ آدم کی فلاح کا کفیل ہے۔ اسلام یقیناً امن وسلامتی کا دین ہے۔ فتنہ وفساد جتنا شیطان کو پسند ہے اتنا ہی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناپسند ہے۔ امن وامان خود بخود نہیں پھیلتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں۔ ایک اچھے معاشرے میں جب حقدار کو اس کا پورا حق دیا جاتا ہے، تو وہاں نہ تجارت تباہ ہوتی ہے اور نہ زراعت۔ بلکہ ایسا معاشرہ عدل وانصاف کی وجہ سے رُو بہ ترقی رہتا ہے۔

مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبے کی تاریخ سے اسلامی معاشرہ میں جہاں سیاسی شعبہ میں تبدیلیاں آئیں۔ وہاں مسلمانوں کا تمدن و اخلاق اور خصوصاً معاش کا شعبہ بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ دشمنانِ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں تشکیک کے جراثیم داخل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چنانچہ آج کل اقتصادیات کے ضمن میں سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے حاملین نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ اللہ کی اس مخلوق کو باور کرانے کی فکر میں ہیں،

کہ اقتصادی ناہمواریاں صرف ہمارے نظاموں سے ہی ختم ہو سکتی ہیں لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں زندگی کا ایک مکمل نظام موجود ہے جب کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام افراط و تفریط کے راستے ہیں۔ صراطِ مستقیم صرف وہ ہے جو اسلام نے بتایا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ اسلام پر یونانی فلسفہ چھا گیا تھا۔ دنیا کے عام قانون کے مطابق لِکُلِّ فرعون موسیٰ (باطل کا سر کچلنے کے لئے ایک موسیٰ ہوا کرتا ہے) پانچویں صدی میں اسلام کے ایک عظیم سپوت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے علوم نبویؐ سے مسلح ہو کر فلسفہ یونان پر زوردار حملہ کیا اور "تہافۃ الفلاسفہ" کے عنوان سے وہ معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس کی کاری ضرب سے فلسفۂ یونان کی عمارت دھڑام سے زمین پر آگئی تھی۔ آج پھر سرمایہ داریت اور اشتراکیت کا فلسفہ دنیا والوں سے ان کا خدا اور ان کے عقائد چھین رہا ہے۔ اس لئے آج پھر ایک غزالی کی ضرورت ہے۔ کیا خوب کہا ہے شاعر مشرق نے۔

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں امام غزالیؒ کی روحانی اولاد میں شمس العلماء والمسلمین استاذنا المکرم مولانا شمس الحق افغانی دامت برکاتہم (جو غزالیٔ دوراں، محدث کبیر حضرت مولانا سید

انور شاہ کشمیری اور رازیٔ زمان حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ الاسلام اور حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے جانشین ہیں) نے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ" کے عنوان سے ایک مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے۔ جو اس سے قبل دو مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔ اب تیسری بار یہ مضمون مکتبۃ الحسن لاہور کو ہمارے ایک فاضل دوست حضرت مولانا احمد عبدالرحمٰن صدیقی نوشہروی کے ذریعے طباعت کے لئے ملا ہے۔ راقم الحروف اور حضرت مولانا محمد اجمل خاں صاحب اور صاحبزادہ مولانا فضل الرحیم، حاجی حبیب الرحمٰن صاحب اور ڈاکٹر مخدومی صاحب صدیقی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے مذکورہ بالا کتاب طباعت کیلئے مکتبۃ الحسن کو عنایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ موصوف ممدوح اور مکتبۃ الحسن لاہور کے اربابِ اختیار کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

استاذنا المحترم مصنّفِ کتاب حضرت علامہ افغانی دامت برکاتہم کی مختصر سوانح عمری

آپ ۷ رمضان المبارک ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء کو ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں مولانا غلام حیدر بن مولانا خان عالم بن مولانا سعد اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور صوبہ سرحد و افغانستان کے مختلف اکابر علماء سے دینی

کتب پڑھیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ سند الفراغ حاصل کرنے کے بعد علمِ طب کی تکمیل بھی دارالعلوم دیوبند میں کی۔ اور جون ۱۹۲۲ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔

تدریسی و تبلیغی خدمات

ایک عرصہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں اور دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر اساتذہ میں آپ کا شمار ہے۔ ہندوستان میں جب شدھی کی تحریک زوروں پر تھی اس وقت حضرت افغانی دارالعلوم دیوبند کیطرف سے فتنۂ ارتداد اور شدھی کی تحریک کی روک تھام کے لئے ان پچاس مبلغین کے قائد تھے۔ جو مادرِ علمی کی طرف سے راجپوتانہ بھیجے گئے تھے آریوں کے مشہور مناظرین کو عام جلسوں میں عبرت ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور حضرت کی محنت سے بے شمار ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

علاوہ ازیں ۱۳۴۱ھ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں بطور صدر مدرس خدمات انجام دیں۔ اور ۱۳۴۲ھ میں مدرسہ ارشاد العلوم قصبہ علی خان لاڑکانہ سندھ میں، بحیثیت صدرِ مدرس کام کرتے رہے۔ ۱۳۴۶ھ میں مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ لاہور میں بطور صدر مدرس اور پھر ۱۳۵۰ھ میں دارالفیوض ہاشمیہ سجاول سندھ میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۹ء میں متحدہ ریاست ہائے قلات۔ خاران مکران لسبیلا کے وزیر معارف مقرر ہوئے۔ درمیان میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اپنے استاد سید انور شاہ کشمیریؒ کے جانشین کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ اور پھر ملک

کی تقسیم کے بعد دوبارہ ۱۹۵۶ء تک قلات میں بطور وزیر معارف خدمات انجام دیں، ۱۹۶۲ء میں بطور شیخ التفسیر والحدیث اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ میں پڑھاتے رہے۔ جب کہ ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں ابتداً بطور شیخ التفسیر اور پھر بطور رئیس الجامعہ خدمات انجام دیتے رہے گزشتہ تین سال سے اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے ممبر تھے۔ حضرت افغانی کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

تصانیف

۱۔ معین القضاۃ والمفتیین۔
۲۔ شرح ضابطۂ دیوانی۔
۳۔ علوم القرآن۔
۴۔ سوشلزم اور اسلام۔
۵۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔
۶۔ اسلام عالمگیر مذہب ہے۔
۷۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ۔
۸۔ عالمی مشکلات اوران کا قرآنی حل۔
۹۔ مدارس کا معاشرے پر اثر۔
۱۰۔ معدن السرور فی فتوی بہاولپور۔
۱۱۔ ترقی اور اسلام۔

۱۲۔ آئینۂ آریہ۔
۱۳۔ تصوف اور تعمیرِ کردار۔
۱۴۔ احکام القرآن۔
۱۵۔ اسلامی جہاد۔
۱۶۔ مفردات القرآن۔
۱۷۔ حقیقتِ زمان ومکان۔
۱۸۔ تنقیح الشذی علی جامع الترمذی۔
۱۹۔ سائنس اور اسلام۔

صوفیانہ مسلک سلسلۂ قادریہ میں پہلے اپنے والد صاحب سے بیعت ہوئے اور پھر حضرت مولانا غلام محمد دین پوریؒ سے کسب فیض کیا۔ یوں ہی حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے اور حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ سے خلافت ملی۔

اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کو تادیر ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ان کے دینی، روحانی، فیوضات سے بندگانِ خدا فیض حاصل کرتے رہیں۔ آمین یارب العالمین۔

—— احقر ——

علی اصغر عباسی
خطیب جامع مسجد۔ نیلا گنبد
لاہور

حصّہ اوّل

"سرمایہ دارانہ نظام"

وسائلِ معاش اور ضروریات کی تحصیل انسان کے سادہ دور میں نہایت آسان اور سہل تھی، درختوں کے پھل اور شکار بری و بحری کے گوشت اور سادہ لباس اور معمولی خیموں جھونپڑوں اور کچے مکانات اور لکڑی، چمڑے، ٹھیکرے کے معمولی ظروف اور برتنوں پر انسانی زندگی کا مدار تھا جو نہایت آسان اور سہل الحصول تھے جس کے لیے نہ وسیع سرمایہ کی ضرورت تھی اور نہ اس کے لیے حبِ مال اور حرص شدید کی تشنگی بجھانے کے لیے دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کی ضرورت تھی تاکہ استحصال اور استعمار کی نوبت آتی۔ اس سادہ طرزِ حیات کے بعد تمدن وجود میں آیا اور اس نے بڑھتے بڑھتے دورِ حاضر میں ارتقائی شکل اختیار کی جس کی وجہ سے معاشی ضروریات اور حاجات کا دائرہ اس قدر وسیع ہوگیا کہ اس دور کے ایک متمدن انسان کی ضروریات کا خرچ سادہ دورِ حیات کے سو افراد کی ضروریات کے خرچ کے برابر ہونے لگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ متمدن زندگی کا ہر فرد بیش از بیش سرمایہ فراہم کرنے کے لیے جد وجہد کرنے لگا جس سے سادہ زندگی عیاشانہ زندگی میں اور کفایت شعاری اور قناعت، اسراف اور حرص میں تبدیل ہوتی جو آگے چل کر سرمایہ دارانہ نظامِ حیات کے لیے سنگِ بنیاد بنا عیاشانہ

زندگی نے مختلف دوائر میں اپنا عمل ظاہر کیا۔

۱۔ ماکولات خوراک کے سلسلے میں تعیش نے ظہور کیا اور مختلف الاقسام کھانے وجود میں آئے اور ان کے لیے مختلف ظروف اور برتن ایجاد ہوئے اور میز پر ان کو ترتیب کے ساتھ رکھنے کے لیے بڑی تنخواہوں کے ماہر فن ملازم رکھنے پڑے جن کی تنخواہ بعض ملکوں میں پانچ ہزار ماہوار تک پہنچی جو چرچل سابق وزیر اعظم برطانیہ کی تنخواہ کے برابر ہے۔

۲۔ مشروبات تعیش نے پینے کے دائرہ میں بھی توسیع کی اور شراب کے علاوہ سینکڑوں قسم کی بوتلیں استعمال میں آنے لگیں اور شراب نوشی میں حد سے زیادہ اضافہ ہونے لگا۔

۱۔۔۔ امریکہ کے صرف ایک مشروب یعنی شراب کا سالانہ خرچ نو ارب پندرہ کروڑ ڈالر ہے۔ دیکھئے نیویارک کی سرکاری رپورٹ مندرجہ میزان کوئٹہ ۱۶ر جولائی ۱۹۵۲ء۔

۲۔۔۔ ملکہ الزبتھ ۲۹ واں کے ایک محفل تاج پوشی میں ۲۴ کروڑ روپے کی شراب صرف ہوئی۔ دیکھئے رپورٹ مندرجہ امروز ۳ر جون ۱۹۵۳ء اور عام طور پر انگلستان میں سالانہ شراب نوشی پر چار ارب چوہتر کروڑ کی رقم خرچ ہوتی ہے۔ سچ ۳ر مئی ۱۹۳۶ء

۳۔ ملبوسات وغیرہ مردانہ اور زنانہ ملبوسات میں تمدن حاضر کی برکت سے وہ اضافہ ہوا کہ انسان اور کتوں کے علاوہ بے جان دیواروں

کی آرائش کو بھی بیش قیمت کپڑوں سے سجایا گیا اور اس کو تمدن کا لازمی جزو سمجھا گیا۔ ملبوسات کے علاوہ انگلینڈ کی عورتوں کا صرف عطریات کا سالانہ خرچ چھ کروڑ اٹھارہ لاکھ پونڈ ہے۔ (انجام ۲ر اگست ۱۹۵۸ء) امریکہ میں کتوں کے کمبلوں اور تفریح پر سالانہ ۵۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر کی رقم خرچ ہوتی ہے۔ (نقاد لاہور جولائی ۱۹۵۳ء) برطانیہ کا سالانہ خرچ تفریح ایک ارب ۵۲ کروڑ پونڈ ہے۔ (زمیندار ۴ر فروری ۱۹۵۱ء)

۴۔ مسکن اور غیر فطری ذرائع معاش سرمایہ داروں نے تسکین خواہشات کے لئے وہ عمارتیں بنائیں اور ان پر وہ گراں بہا رقومات صرف کی گئیں کہ جو انسانی آبادی کے بڑے حصہ کی ضروریات حیات کے لیے کافی ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ سرمایہ دار افراد نے اپنی تسکین شہوت کے لیے زنا کی دلالی اور رقص و سرود کے وہ پیشے ایجاد کیے جس نے صنف نازک کے ایک بڑے طبقے کو معاشرے کے ضروری کاموں سے کاٹ کر ان غیر فطری اور مخرب اخلاق پیشوں میں لگا دیا۔ بلکہ سرمایہ داروں کی مزید تسکین کے لیے افسانہ نویسی، مسخرہ گری اور سینماؤں کی فحش تصاویر کی دنیا بھی وجود میں آئی یہاں تک کہ مسلمان بھی اس کی نقل اتارنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جس کو دیکھ اقبال مرحوم کو یہ کہنا پڑا ہے ؎

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے — سینما ہے یا صنعت آزری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا! — یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے

ایک مشہور مسخرے چارلی چپلن کی آمدنی تمام ملکوں کے وزیرِاعظموں سے زیادہ تھی۔

۵۔ قمار بازی اور سگریٹ نوشی

سرمایہ دار تمدن کی تسکین شہوت جب امورِ بالا سے پوری نہ ہوئی تو تمدنِ حاضر نے قمار بازی کی مختلف شکلوں کو جزوِ زندگی بنادیا۔ چنانچہ سرکاری رپورٹ کے مطابق یورپی دنیا صرف قانونی جوا بازی پر ہر سال تیس ارب ڈالر کی رقم خرچ کرتی ہے جو ایک کھرب روپیے سے زیادہ ہے اور جس سے پوری دنیا کی آبادی کئی سال تک پل سکتی ہے۔ غیر قانونی جوا اس کے علاوہ ہے۔ (دیکھیے کوہستان ۲۰ دسمبر ۱۹۵۹ء) تمدن حاضر کی برکت سے امریکہ میں سالانہ ۴ کھرب ۲۳ ارب سگریٹ خرچ ہوتے ہیں۔ جاپان میں ۹ ارب، برطانیہ میں ایک کھرب ۱۱ ارب، فرانس میں ۳۶ ارب، مغربی جرمنی اور اٹلی میں ۳۶ ارب، میکسیکو میں ۲۶ ارب اسّی کروڑ، کینیڈا میں ۲۱ ارب، جنوبی کوریا میں ۱۴ ارب ۳۰ کروڑ، فلپائن میں ۱۲ ارب ۳۰ کروڑ صرف ہوتے ہیں (دیکھیے رپورٹ مندرجہ انجام ۱۰ فروری ۱۹۵۵ء) جس کی قیمت کم از کم ۵۰ ارب ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیے ہے جو یقیناً پوری دنیا کی ضروریات کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہ رقم سگریٹ کی شکل میں آگ میں پھونکی جاتی ہے۔ پھر بھی وہ عقلمند کہلاتے ہیں نہ دیوانے۔ لیکن اگر ایک آدمی صرف ۵ روپے کا نوٹ آگ میں جلا دے تو بالاتفاق دیوانہ کہلائے گا ؏

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست بہ کجا

ملک گیری اور استعمار

سرمایہ دار نظام کے مذکورہ شیطانی اخراجات کے لیے

چونکہ ملکی آمدنی کافی نہیں ہوتی، اس لیے یہ نظام استعمار کو جنم دیتا ہے تاکہ دیگر ممالک کی پیداوار پر قبضہ کرکے ان اخراجات کو پورا کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے ملک میں اپنی مصنوعات کی مانگ محدود ہوتی ہے۔ اسی لیے ایسے سرمایہ دار ممالک ان زوائد مصنوعات کو فروخت کرنے کے لیے دیگر ممالک میں منڈیاں تلاش کرتے ہیں تاکہ اپنی مصنوعات کی نفع بخش تجارت سے اپنی عیاشانہ ضروریات کو پورا کرسکیں۔ اسی قسم کی جد و جہد چونکہ ہر سرمایہ دار ملک کرتا ہے، اسی لیے ہر حکومت چاہتی ہے کہ دوسرے ممالک کو وہ استعمار کی صورت میں زیرِاثر رکھ کر اپنی تجارت کو فروغ دے سکے اور ان مستعمرات کو اپنی مصنوعات کے لیے مختص کرسکے، دیگر ممالک پر درآمد کا محصول بڑھا دے تاکہ ان کی اشیاء کی قیمت نسبتاً زیادہ ہو اور اپنی مصنوعات کا محصول برائے نام ہو تاکہ سستا ہونے کی وجہ سے زیادہ مقدار میں ان کو فروخت کیا جاسکے۔ ان استعماری مقاصد کی کشمکش میں اکثر جنگ کی بھی نوبت آجاتی ہے اور استعماری قومیں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ اسی لیے استعمار جنگ کو جنم دیتا ہے اور استعماری قوتوں میں آلاتِ حرب کی تیاری کی دوڑ شروع ہوجاتی ہے اور پھر وہ سرمایہ جنگ کے سامان پر خرچ ہونے لگتا ہے جو ضروریاتِ حیات ہی کے لیے مخصوص تھا۔

آلاتِ حرب کی تیاری میں صرفِ دولت

نظامِ سرمایہ داری کے تحت ہر مملکت اپنی قوت میں اضافہ کرتی ہے، تاکہ دوسرے ممالک ان کے استعماری مقاصد میں خلل انداز نہ ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

ملک کی دولت کا اکثر حصہ گولہ بارود کی شکل میں آگ میں پھونک دیا جاتا ہے اور اقوامِ عالم کی معاشی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس وقت استعماری حکومتوں کے جنگی اخراجات حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں لیکن سولہ سال پیشتر کے جنگی اخراجات بھی کچھ کم نہیں ۱۹۵۲ء میں امریکہ کا جنگی بجٹ ۹۰ کھرب ڈالر تھا۔ دکوثر ۱۵ اپریل ۱۹۵۲ء) جس سے صدیوں تک پوری انسانی آبادی کی ضروریات پوری کی جا سکتی تھیں۔ امریکہ نے اتنی بڑی دولت کو خیالی استعماری مقاصد کے لیے صرف کیا یا نذرِ آتش کیا۔ ۹۰ کھرب ڈالر کی بجائے اگر ایک انسان صرف نو روپے برباد کرے تو دیوانہ کہلائے گا لیکن نوے کھرب ڈالر برباد کرنے والے امریکہ کو کوئی پاگل نہیں سمجھتا بلکہ سب اس کو عقلمند قرار دیتے ہیں۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جنگ کے سامان پر رقم صرف نہ کی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جنگ برائے ظلم پر رقم خرچ نہ ہو کہ ایسی جنگ بڑا انسانی جرم ہے، نہ جنگ برائے اقامتِ عدل کہ وہ درحقیقت بڑی انسانی خدمت ہے اور اس میں عالمی حقوق کے تحفظ کا راز مضمر ہے۔

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است — جنگِ مومن سنتِ پیغمبر است

سرمایہ دارانہ جذبہ اور سود

سرمایہ دارانہ نظام کے تحت آج کل سودی کاروبار کی جو وسعت نظر آ رہی ہے اس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے سودی کاروبار کو جزءِ زندگی بنا دیا ہے۔ یہاں

تک کہ سرمایہ دار ملکوں میں کسی محتاج ترین فرد کو پانچ روپے بلا سود بطور قرضہ نہیں مل سکتے۔

اب ہم الکتازیّت اور سرمایہ دارانہ نظام کے وہ نقصانات اور تباہیاں مختصر طور پر بیان کرتے ہیں جو اس نظام کی بدولت مہلک جراثیم کی شکل میں انسانی معاشرے میں پیوست ہو چکے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی دینی تباہی

ا۔ زوالِ محبتِ الٰہیہ

دین کی رُوح یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت راسخ اور مضبوط ہو اور قلب پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف جھکے۔ اسی جھکاؤ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ دل پر اللہ کی عظمت اور مخلوقِ خدا کی شفقت کا رنگ چڑھتا ہے۔ اس سے اللہ اور انسان کے حقوق کے تحفظ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور پوری زندگی الٰہی ہدایات کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔ لیکن سرمایہ داروں کی محبت کا رُخ مال اور سرمایہ بڑھانے کی طرف پلٹ جاتا ہے اور ان کی پوری زندگی سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لیے وقف ہوتی ہے اور اللہ اور اس کی مخلوق سے محبت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ حیوانات کی طرح کسی پابندی کو قبول کیے بغیر وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جس سے اس کے سرمایہ میں اضافہ ہو، خواہ سود ہو، خواہ رشوت، خواہ غصب و قمار بازی۔ گویا سرمایہ اس کے لیے دین سے بغاوت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی۔ یوں نہیں بلکہ انسان اللہ کے قانونِ انصاف کا باغی بن جاتا

ہے جب وہ غنی بن جاتا ہے۔

۲۔ زوالِ محبتِ انسانیہ تکمیلِ انسانیت کے لیے انسان کو اللہ اور دیگر انسانوں کے ساتھ ارتباط ضروری ہے جس کی بنیاد محبت پر قائم ہے۔

جب سرمایہ کی محبت غالب آجاتی ہے تو یہ اللہ اور بنی نوع انسان دونوں کی محبت کو ختم کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے الٰہی اور انسانی حقوق کی ذمہ داری کا احساس فنا ہو جاتا ہے اور فرد کا رشتۂ محبت جماعت سے کٹ جاتا ہے اور شخصی مفاد غالب ہونے کی وجہ سے اس سے معاشرے میں بے شمار مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ محبت کا تقابلی فلسفہ یہ ہے کہ جب ایک شے کی محبت میں حد سے زیادہ اضافہ ہو تو اسی تناسب سے دوسری شے کی محبت میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے بلکہ بالتدریج اس کی محبت فنا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کی دو بیویاں ہوں تو جب ایک کی محبت زیادہ ہو جاتی ہے تو دوسری بیوی کی محبت میں لامحالہ کمی آجائے گی۔ اسی فلسفہ کے تحت سرمایہ دار پر حبِّ ذات و مال غالب آجاتی ہے اور حبِّ انسان مغلوب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دیگر انسان کی محبت اگر کسی وقت اس کے دل میں پیدا ہو تو وہ بھی جب کہ اس انسان سے اس کو کوئی غرض اور نفع وابستہ ہو۔ یہ بالواسطہ محبت درحقیقت حبِّ انسان عمومی نہیں بلکہ حبِّ ذات ہے کہ اس کی ذات کا کوئی فائدہ اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا دل ذاتی مفاد کے سوا کسی طرف پلٹتا نہیں، نہ خدا کی طرف، نہ بنی نوع انسان کی طرف۔ تو درحقیقت اس کا

دل قلب ہی نہ رہا۔ کیونکہ قلب اور دل کا کام پلٹنا ہے۔ وَمَا سُمِّیَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِہٖ وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّہٗ یَتَقَلَّبُ۔ جب اُنس اور محبت اور دل کا دوسرے کے مفاد کی طرف پلٹ جانا ایک انسان میں باقی نہ رہے تو وہ درحقیقت انسان ہی نہ رہا۔ اگرچہ اس کی صورت انسانی ہو۔ جیسے کاغذی گھوڑا گھوڑے کی صورت رکھنے کے باوجود حقیقی گھوڑا کہلانے کا مستحق نہیں۔ بقول عارف رومی ؎

آنچہ می بینی خلاف آدمی اند　　　　نیستند آدمی غلاف آدم اند

سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقی تباہیاں

اس نظام سے اخلاقِ فاضلہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اخلاقِ رذیلہ کا استحکام پیدا ہوتا ہے۔ انسانیت کے بلند اخلاقی اقدار حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **ایثار:** یعنی اپنے مفاد کو دوسرے انسانوں کے مفاد پر قربان کر دینا۔

۲۔ **رحمت و شفقت:** یعنی دوسرے انسانوں کی حاجت مندی اور دکھ سے متاثر ہونا اور اس تاثر کے تقاضا پر عمل کرنا۔

۳۔ **ہمدردی:** جس کو عربی میں نصیحت کہتے ہیں جس کا معنٰی ہے دوسرے انسانوں کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھنا اور اس کے مقتضٰی پر عمل پیرا ہونا۔

۴۔ **شجاعت:** یعنی بہادری جس سے انسانیت کے بلند ترین مقاصد کے لیے جان کی قربانی دینا۔

۵۔ **سخاوت: بنی نوع انسان کی حاجت روائی کے لیے مال کو قربان کر دینا**

یہ وہ بنیادی اخلاق ہیں جن کے حسن و خوبی پر اقوامِ عالم متفق ہیں اور جن کو انسان کے فطری کمالات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہ وہ روشن خوبیاں ہیں جو تمام انبیاء علیہم السلام کے متفقہ ہدایات کا لبِّ لباب ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام سے انسان جس سانچے میں ڈھل جاتا ہے اس میں اخلاقِ پنجگانہ کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۱۔ ایثار سرمایہ دار جب اپنے محتاج بھائی کو بلاسود ایک کوڑی نہیں دے سکتا تو اس میں ایثار کہاں سے آئے گا بلکہ ایثار کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے اس کے دل میں حرص اور شخصی مفاد کا تخم بو دیا ہے۔ اس کے جذبۂ حرص کا تقاضا تو یہ ہے کہ فقر و افلاس، محتاجی اور مصیبت اور بڑھے تاکہ سودی کاروبار خوب چمکے۔

۲۔ شفقت اور رحمت اور سرمایہ داری ایسا شخص جس کو سرمایہ دارانہ نظام نے سود کا خوگر بنا دیا ہے اور وہ افزائشِ دولت کے جذبہ سے سرشار ہے وہ اپنی کامیابی اس میں منحصر سمجھتا ہے کہ فقراء اور محتاجوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو تاکہ سودی بازار کی خوب چلت ہو اور عوام کی محتاجی سے فائدہ اٹھا کر دولت میں اضافہ کیا جا سکے۔ چور ڈاکو کے لیے یہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کا دل بدل جائے اور شفقت و رحمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر چوری اور ڈاکہ چھوڑ دے۔ لیکن سود خور کی سود خوری سے باز آجانا اور تائب ہو جانا ممکن نہیں۔ خاص کر جب قانونِ وقت میں وہ جرم بھی نہ ہو۔ اس لیے سود خور کا دل انسانی شفقت و رحمت

سے خالی ہوتا ہے۔

۳۔ ہمدردی اور خیر خواہی جس سرمایہ دار کی روزی اور نفع اندوزی دوسروں کی مصیبت، غربت و افلاس پر مبنی ہو اس میں ہمدردی کا جذبہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟ ہمدردی کا معنی تو یہ ہے کہ دوسروں کا نفع اپنا نفع اور دوسروں کا ضرر اپنا ضرر سمجھیں۔ لیکن یہاں تو بقول متنبی دوسروں کی مصیبت کو وہ اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔

مصائب قوم عند قوم فوائد

شجاعت اور سرمایہ داری شجاعت اس کا نام ہے کہ ایک آدمی منفعت عامہ اور انسانیت کے بلند مقاصد کے لیے جان کی قربانی دے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا ایک فرد جب ایک محتاج کی حاجت روائی کیلئے بلاسود پانچ روپے نہیں دے سکتا تو وہ جان کی قربانی کب دے سکے گا؟

یہی وجہ ہے کہ سود خور اقوام سخت بزدل اور شجاعت سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسی قومیں جب فوج کو لڑاتی ہیں تو شراب نوشی کے ذریعہ مصنوعی شجاعت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن حقیقت پھر بھی نہیں بدلتی جس کی بڑی دلیل دنیا کی عظیم ترین سرمایہ دار حکومت امریکہ کی وہ جنگ ہے جو وہ گزشتہ چند سالوں سے اپنے بے پناہ وسائل کے ذریعہ ایک چھوٹی غیر ترقی یافتہ معمولی ریاست سے لڑ رہی ہے یعنی شمالی کوریا اور شمالی ویٹ نام کے ساتھ۔ امریکہ نے ان دونوں لڑائیوں میں اپنی پوری قوت جھونک دی۔ لیکن نہ وہ شمالی کوریا کو شکست دے سکا اور نہ شمالی ویٹنام

کو شکست دے سکتا ہے اور نہ دے سکے گا ـــــ ان دونوں جنگوں نے ثابت کر دیا کہ سرمایہ دار سود خور قومیں بنیوں کی طرح بہادری سے خالی ہوتی ہیں اور بہادری کے بغیر مشینی طاقت فیصلہ کُن نہیں۔

اخلاقی اعتبار سے امریکہ صفر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صفر قوم کو سائنسی آلاتِ حرب اور دولت کا حفاظتی قلعہ کب تک محفوظ رکھ سکتا ہے۔ غالباً جب سرمایہ دار اقوام کی اسلحہ سازی کا ہنر معمولی اقوام میں پھیل جائے گا۔ اگرچہ امریکہ اور یورپ کے برابر نہ ہو تو وہ وقت ان ممالک کی تباہی کا وقت ہوگا اور انسان اور انسان کی جنگ ہو گی تو جس قوم میں اخلاقی اقدار کی برتری ہو گی۔ وہی فتح پائے گی۔

سرمایہ داری نظام کی اقتصادی تباہیاں

پہلا اقتصادی نقصان

کسی قوم کی اقتصادی حالت اس وقت بہتر ہو سکتی ہے، کہ قوم کے تمام افراد کو ضروریاتِ زندگی میسر ہوں اور کوئی فرد ضروریاتِ حیات سے محروم نہ ہو۔ لیکن اگر ایک قوم کے محدود چند افراد کے پاس دولت اور ضروریاتِ حیات کے انبار لگے ہوں اور اکثر افراد ضروریاتِ حیات سے محروم ہوں تو یہ قومی حیثیت سے اقتصادی انحطاط ہے۔ ترقی نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کا یہ خاصہ ہے کہ وہ دولت کو چند افراد یا خاندانوں میں محدود رکھتا ہے۔ جس کو وہ افراط کے ساتھ شیطانی اور مسرفانہ اخراجات میں صرف کر دینے کے باوجود

ختم نہیں کر سکتے اور قوم کی باقی اکثریت مفلوک الحال ہوتی ہے۔ غربت اور افلاس کا دائرہ اس نظام کی وسعت کے انداز پر ہوگا۔

جس قدر ممالک اور اقوام پر سرمایہ دار ملک بالذات یا بالواسطہ اقتدار قائم کر لیتا ہے، ان سب ممالک کی پوری آبادی کی اکثریت مفلوک الحال اور فاقہ مست ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام دولت کے خون کو جذب کرنے میں ایک طاقتور جونک کی طرح ہے کہ جہاں اس کا اثر پہنچا وہاں سے اس نے دولت کا خون چوس لیا۔

آج کل دنیا کے اکثر حصوں پر بالذات یا بالواسطہ سرمایہ دار ملکوں کا اثر ہے۔ اس لیے دنیا کی پوری آبادی کی اکثریت فاقہ میں مبتلا ہے۔ اگرچہ مشینی آلاتِ زراعت اور آبپاشی کے سائنسی وسائل کے ذریعہ زمینی پیداوار بڑھانے میں انتہائی کوشش کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ پھر بھی ان کو سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی بھوک دور کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ جس کی بڑی دلیل اقوامِ متحدہ کی سماجی رپورٹ مندرجہ انجام کراچی ۱۰ مئی ۱۹۵۳ء ہے۔ جس میں درج ہے کہ :-

"دنیا کی آبادی کا نصف حصّہ فاقہ کشی اور ضروریات مہیا نہ ہونے کی وجہ سے بیماری میں مبتلا ہے۔"

معلوم ہوا کہ دنیا کی نصف آبادی کے پاس نہ خوراک کے لیے روپیہ ہے اور نہ علاج کے لیے دوا کی قیمت۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے زمین کی مجموعی دولت بقدرِ ضرورت تمام انسانوں کے حصّہ میں نہیں آئی۔ بلکہ چند مہاجنوں، کارخانہ داروں

اور سود خوروں میں بند ہوگئی ہے۔ دولت اجتماعی زندگی کے لیے ایسی ہے جیسے خون شخصی زندگی کے لیے۔ اگر بدن سے حاصل شدہ خون کسی ایک عضو میں بند ہو جائے تو باقی اعضاء کی نشو ونما کے لیے کیا بچے گا؟ اور ایسی صورت میں ان کا کیا حال ہوگا؟

اسی طرح انسانیت بھی ایک واحد وجود ہے اور مختلف طبقات مختلف اعضاء ہیں۔ اگر ایک طبقہ یعنی امراء انسانی مادۂ حیات یعنی وسائلِ رزق پر قابض ہو جاتا ہے تو باقی طبقات کی محرومی یقینی ہو جاتی ہے۔ قرآنِ مجید نے مال کو مادۂ حیاتِ انسانی قرار دیا ہے:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ	تم نادانوں کے ہاتھ میں مال مت
اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ	دو جس سے تمہاری زندگی قائم
لَكُمْ قِیٰمًا	ہے۔

آج کل انسانی اموال پر تقریباً سفہاء اور بے وقوفوں کا قبضہ ہے جس کو وہ بیجا اڑا کر خرچ کرتے ہیں، جیسے آگے چل کر بیان ہوگا۔ مادۂ حیات مال ہے اجتماعی زندگی کے لیے، جس طرح خون شخصی زندگی کے لیے مادۂ حیات ہے تو مادۂ حیات کا چند افراد یا خاندانوں میں بند ہو جانا نامعقول ہے بلکہ خون کی طرح اس کی گردش اور حرکت ضروری ہے۔ قرآن مجید نے مالِ غنیمت پوری فوج پر تقسیم کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ	تاکہ مال صرف دولت مند طبقے میں
الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ	چکر نہ لگاتے۔

بلکہ دیگر افراد بھی اس سے متمتع ہو سکیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کا دوسرا اقتصادی نقصان

سرمایہ دارانہ نظام میں ناجائز کمائی کی وجہ سے مثلاً رشوت، قمار بازی، عقودِ فاسدہ، غصب، نہب، سمگلنگ وغیرہ کی وجہ سے ایک خاص طبقہ میں افراطِ زر پیدا ہو جاتا ہے جس سے ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور عوام قوتِ خرید نہ ہونے کے باعث ضروریات کی خرید سے عاجز ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ غربت و افلاس اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں صرف ایک قلیل طبقہ خوشحال ہوتا ہے لیکن عوام کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ اس لیے عوام کی اقتصادی حالت ناہموار ہو جاتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا اقتصادی نقصان

عوام جب محنت کر کے بھی افراطِ زر اور اشیائے صرف کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے اس کو نہیں خرید سکتے اور باوجود مشقت کرنے کے بھوک اور افلاس میں مبتلا رہتے ہیں تو اجرتِ عمل کے اضافہ کے لیے ہڑتالوں کی نوبت آتی ہے جب اس سے بھی مقصد پورا نہیں ہوتا تو ان کے جذبۂ عمل اور جوشِ محنت میں کمی پیدا ہو جاتی ہے جس سے کسبِ مال کی تحریک کمزور ہو جاتی ہے اور برآمد کی کمی کی وجہ سے عمومی معاشی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں روزمرہ ان امور کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

سرمایہ داری کا پہلا سیاسی نقصان

مستحکم حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ

عوام مطمئن ہوں اور ان میں باہمی چپقلش اور طبقاتی خصومت اور منازعت نہ ۔ لیکن سرمایہ
دارانہ نظام کا خاصہ ہے کہ اس میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہونے لگتا ہے۔ جس
سے طبقاتی جنگ پیدا ہو جاتی ہے اور جب عوام یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس جنگ
اور خستہ حالی کا اصلی سبب وہ حکومت ہے جو اس نظام کی حفاظت کرتی ہے اور اس
نظام کو قائم رکھنا چاہتی ہے تو عوام کی نفرت کا رُخ حکومت کی طرف پھر جاتا ہے،
اور عوام اور حکومت میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور تنگ آمد بجنگ آمد کے
اصول کے تحت عوام اور حکومت کے تصادم کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو جاتا ہے ۔

غلام گرسنہ دیدی کہ بر زور بدر آخر
قبائے شاہ کہ رنگین ز خون ما آلودہ است

اور کسان کے ضمیر کی یہ آواز ہوتی ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

آپ کو ہڑتالوں اور بغاوتوں کا سلسلہ جن حکومتوں میں نظر آتا ہے وہ اسی ناہموار
معاشی نظام کا نتیجہ ہے جس سے حکومت غیر مستحکم ہو جاتی ہے۔

سرمایہ داری کا دوسرا سیاسی نقصان

سرمایہ دارانہ نظام عوام کو دو حصوں میں
تقسیم کرتا ہے امیر، غریب ۔ امراء میں
جب مال کی بنا پر بزدلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا لازمی نتیجہ ہے اور غرباء میں نظام

حکومت سے نفرت کی وجہ سے بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اب حکومت
کے پاس اپنی مملکت کی حفاظت اور دفاع کے لیے کچھ نہیں رہتا۔ امراء بزدلی کی وجہ سے
اہلیتِ دفاع سے محروم ہوتے ہیں اور غریب عوام خود حکومت سے متنفر ہوتے ہیں۔ حکومت
کی حفاظت قربانی اور جذبۂ جاں نثاری کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے بیرونی حملہ آور
آسانی سے ایسے ملک پر قبضہ کر سکتا ہے۔

ویٹ نام کی جنگ اس کی بیّن دلیل ہے۔ عوام ویٹ کانگ اس جنگ میں جس
بہادری کا ثبوت دے رہے ہیں، امریکی عوام میں وہ جذبہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ
کو اپنے بے پناہ وسائل جنگ کو کام میں لانے کے باوجود اس چھوٹی سی ریاست کے
مقابلے میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی بلکہ شکست ہو رہی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ
میدانِ جنگ میں ہتھیار اور آلاتِ حرب خود نہیں لڑتے بلکہ انسانی قوت ان آلات کو
استعمال کرتی ہے اور ان کی قوتِ قلبی شجاعت اور جفاکشی، جوشِ عمل پر فتح و شکست
کا مدار ہوتا ہے اور وہ امریکی عوام میں صفر ہے۔ اب تو سائنسی آلاتِ حرب اور دولت
نے کچھ اس کی لاج رکھی ہے۔ جب یہ آلات عام ہو جائیں گے تو امریکہ کا انحطاط
نمایاں ہو جائے گا اور پردہ چاک ہو جائے گا۔

سرمایہ داری کا تیسرا سیاسی نقصان

مضبوط سیاسی نظام کے لیے یہ ضروری ہے کہ
قوم اور مملکت کے تمام افراد متحد اور منظم ہوں۔
ان میں انتشار، تفریق اور طبقاتی کشمکش نہ ہو۔ ورنہ سیاسی نظام کا شیرازہ درہم برہم

ہو جاتا ہے اور داخلی کمزوری کی وجہ سے قوم اور مملکت ضعیف ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ کشمکش ضرور موجود ہوتی ہے۔ اسی کمزوری کی وجہ سے ایسی مملکت حملہ آور کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عیسائی ادیب اور مؤرخ جرجی زیدان کا خیال ہے کہ اسلامی قوت نے روم اور فارس کی حکومت کو اس وجہ سے شکست دی کہ ان میں سرمایہ داروں کے نظام کی وجہ سے عوام بددل تھے اور اسلامی انصاف کے لیے چشم براہ تھے۔ یہ بات اگرچہ کلیۃً درست نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اسلامی مملکت کا اندرونی، معاشی اور عدالتی نظام مقابلۃً معقول اور مستحکم تھا۔

سرمایہ داری کا چوتھا سیاسی نقصان

سیاسی استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ افرادِ مملکت صحت بدن، پختگی کردار، اخلاق، جفاکشی اور موت سے بے خوفی جیسے اوصاف کے حامل ہوں تاکہ وہ زندگی کے تلخ واقعات کا پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام جس قسم کی عیاشانہ زندگی کو جنم دیتا ہے، وہ ان صفات کے خلاف ہوتی ہے۔ اخلاقی قوت اور پختگی سیرت کو تباہ کرنے والی چیزیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ شراب نوشی ۲۔ سگریٹ ۳۔ زنا ۴۔ لواطت اور اغلام ۵۔ چوری

اب سرمایہ دار ممالک کی اخلاقی کیفیت ملاحظہ ہو۔

شراب انگلستان میں سالانہ ۴ ارب ۴ کروڑ روپے کی شراب لنڈھائی جاتی

ہے (پنچ، ۱۰ مئی ۱۹۲۰ء) یہ چالیس سال قبل کی شراب نوشی ہے۔

امریکہ کے باشندے شراب پر سالانہ ۹ ارب ۱۵ کروڑ ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ اگر ڈالر کی قیمت پانچ روپے پاکستانی ہو تو مجموعی طور پر شراب کا خرچ پاکستانی سکہ کے حساب سے ۴۵ ارب ۷۵ کروڑ روپے ہے۔ (میزان کوئٹہ ۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء)

صرف ملکہ الزبتھ ۲۹ واں کے جشن تاجپوشی کی مجلس میں ۲۴ کروڑ روپے کی شراب خرچ ہوئی۔ (امروز ۳ جون ۱۹۵۳ء)

سگریٹ رپورٹ مندرجہ انجام کراچی ۱۰ فروری ۱۹۵۵ء کے مطابق صرف آٹھ سرمایہ دار ممالک میں سگریٹ پر سالانہ پچاس ارب پچاس لاکھ کی رقم خرچ کرتے ہیں۔

زنا رپورٹ مندرجہ نوائے وقت لاہور ۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے مطابق گزشتہ جنگِ عظیم میں امریکی فوجوں نے جاپانی ماؤں سے خفیہ اور اسقاط کی صورتوں کے علاوہ بیس لاکھ حرامی بچے چھوڑے اس کے برخلاف اسلامی فوجوں نے دنیا کے اکثر حصہ کو فتح کیا لیکن زنا کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔

امریکہ میں ۱۴ سالہ نوجوان ہیراٹن کے ساتھ تین دوشیزہ عورتوں نے سات مرتبہ زنا بالجبر کیا (پاسبان کوئٹہ ۲۴ مئی ۱۹۵۲ء)

اب تک انسانی تاریخ میں مرد کا زنا بالجبر تو آپ نے سنا ہوگا۔ لیکن عورتوں کا مرد کو زنا پر مجبور کر دینا ترقی کا انوکھا واقعہ ہے۔

۱۳ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے ہتھیار ڈالنے کی خوشی میں سان فرانسسکو میں فوجیوں نے شراب پی، دوکانیں لوٹ لیں اور دوشیزاؤں کی عصمت دری کی اور عام سڑکوں پر ان کو ننگا کر دیا۔ (نوائے وقت لاہور ۲۶ اگست ۱۹۵۳ء) برطانیہ میں مادر زاد ننگوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے (نوائے وقت ۲۲ مئی ۱۹۵۳ء)

لواطت اور اغلام

امریکہ کے سپریم کورٹ کے جج نے دو لاکھ ننگی اور گندی تصویروں کو دیکھ کر کہا کہ "نیویارک سدوم اور عمورہ بنتا جا رہا ہے۔" (یہ قوم لوط علیہ السلام کی لواطت کے جرم میں تباہ شدہ بستیوں کے نام ہیں) (صدق جدید ۳ دسمبر ۱۹۵۴ء)

• اغلام بازی تہذیب فرنگ کا جزء بن گیا ہے۔ (لندن ٹائمز ۲۶ دسمبر ۱۹۵۵ء)

۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو انگلستان کے دار العوام اور دار الامراء میں ۱۴ کے مقابلے میں ۹۹ ووٹوں کی اکثریت کے ساتھ تالیوں کی گونج سے یہ قانون پاس ہوا کہ بالغ مرد باہمی رضامندی کے ساتھ تلذذ بالمثل حاصل کر سکتے ہیں جس پر ملکہ الزبتھ کے دستخط ہو کر اب جواز لواطت انگلستان کا قانون بن گیا۔ (ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، اگست ۱۹۶۷ء)

• انگلستان میں کلیسا، گرجے، پارلیمنٹ اور سب شعبوں میں لواطت عام ہے۔ (صدق جدید ۶ جنوری ۱۹۵۶ء)

چوری

امریکہ کے محکمہ تحقیقات کی رپورٹ ہے کہ امریکہ میں ہر سیکنڈ میں ایک بڑا جرم ہوتا ہے۔ ہر ۲۴ گھنٹے میں ۴۶۳ موٹریں چرائی جاتی ہیں (پاسبان کوئٹہ ۴ جنوری ۱۹۵۰ء)

صدر کینیڈی کی صدارتی تقریب جو واشنگٹن میں منائی گئی۔ اس میں گیارہ ہزار پیالے، چھ ہزار شیشے، ٹرے، چھ سو رومال، ایک بڑی مشین چرائی گئی۔ (ترجمان اسلام ۱۴ اپریل ۱۹۶۱ء)

یہ مشت نمونہ از خروارے ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یورپ کی اخلاقی حالت بے لگامی کی کس حد تک پہنچ گئی ہے۔ ان امور سے جو اخلاقی انحطاط پیدا ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا اصلی سرچشمہ یہود ہیں

آج کل نصف دنیا سے زیادہ ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہے۔ جس کے مفاسد اور تباہیاں مختصر بیان کی گئیں۔ اس نظام اور اس نظام سے پیدا شدہ تباہیوں کا اصلی سرچشمہ قوم یہود ہے۔ اس قوم کا پہلا مرکز فلسطین اور جزیرۃ العرب تھا۔ جن کے سودی کاروبار نے پوری عرب قوم کو مفلس اور قلاش بنا دیا تھا۔ قرآن پاک نے بھی ان کی سرمایہ داری اور اکتنازیت کی شدید مذمت کی اور ارشاد ہوا:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

جو لوگ سونے اور چاندی کے خزانے رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب کی خبر دو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بخاری کتاب الزکوٰۃ میں روایت ہے

کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے حق میں ہے۔ عرب اور بالخصوص مدینہ میں اہلِ کتاب میں سے زیادہ یہودی آباد تھے اور وہی سرمایہ داری اور اکتناز یت کے جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔ اسلام جب غالب آیا تو یہود اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور عرب سے نکل کرکے یورپ میں اور بعد ازاں امریکہ میں پھیل گئے اور اپنا سودی کاروبار اور سرمایہ دارانہ نظام بھی ساتھ لے گئے، جس کو انھوں نے تمام یورپ اور امریکہ میں پھیلا دیا۔ اب بھی یہود کا دعوےٰ ہے کہ وہ دنیا کی چالیس فی صد دولت پر قابض ہیں۔

ان ہی یہود کی وجہ سے نصف دنیا سود اور سرمایہ دارانہ نظام کے جہنم کدہ میں جل رہی ہے اور اسی یہودانہ نظام نے استعمار کی شکل میں دنیا کے ایک بڑے حصے کو غلام بنا دیا ہے، جو بیدار ہونے کے بعد حصولِ آزادی کے لیے برابر لڑتے ہیں۔ استعمار قائم کرنے اور بعد ازاں استعمار سے آزادی حاصل کرنے میں جس قدر خون ریزیاں ہوئیں یا آئندہ ہوں گی یہ اس یہودانہ نظام کے نتائج ہیں۔

سرمایہ دار ممالک کے عوام غریب ہیں

اس ناہموار اور غیر متوازن نظام کے جو مہلک نتائج ہم نے بیان کیے وہ صرف عقلی و منطقی نہیں بلکہ واقعاتی اور تجرباتی ہیں۔

برطانیہ کی آبادی ۱۹۲۹ء میں چار کروڑ تین لاکھ تھی اور فی کس سالانہ آمد فی ستر روپے تھی۔ لیکن اس عظیم تعداد میں لکھ پتی صرف ۵۴۳ تھے۔ (المقتطف مصر نومبر ۱۹۳۰ء)

گویا اسراف کے مرکز میں آسودہ حال یہی چند سو آدمی تھے۔ باقی افراد کا حال ۸ مئی ۱۹۲۷ء کی مندرجہ ذیل رپورٹ احداد مردم شماری میں حسب ذیل ہے:-

"ہمارے ملک انگلستان میں چوتھائی آبادی تقریباً ایک کروڑ ایسی ہے جو ناداری میں زندگی بسر کر رہی ہے اور دوسری ایک کروڑ ایسی ہے جو نیم فاقہ کشی کی حالت میں دن کاٹ رہی ہے جو آرام و آسائش کے نام سے بھی واقف نہیں اور مویشی رکھنے تک پر قادر نہیں۔ انگلستان نے جب فقراء اور مساکین کا حصہ خزانہ میں مقرر کیا تو کہا گیا کہ اب افلاس کم ہوا جس پر "ڈیلی ہیرلڈ" نے لکھا:-

"اب بھی بہت گھرانے ہیں جن کو گوشت سبزی بغیر آلو کے نصیب نہیں ہوا۔"

ایک طرف یہ افلاس اور دوسری طرف آسودہ حال طبقہ سالانہ ۴ ارب ۴ کروڑ کی رقم شراب پر خرچ کرتا ہے۔ اس فقرے نے ربقہ کنٹرول پیدا کیا۔" (سچ لکھنؤ ۵ فروری ۱۹۶۶ء)

یہ اس عظیم سرمایہ دار ملک کا حال ہے جس کی سلطنت پر آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔

امریکہ میں سالانہ اوسطاً ایک لاکھ ڈاکے پڑتے ہیں اور پانچ لاکھ چوریاں ہوتی ہیں جس کا بڑا سبب فقر اور افلاس ہے۔ (سچ ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء بحوالہ سنڈے

ایکسپریس پائنیر الہ آباد)

فقر کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہونے والوں کی تعداد سالانہ صرف انگلستان میں ۵ ہزار ہے۔

اکتنازیت نے اشتراکیت کو جنم دیا

اکتنازیت اور سرمایہ داری کے غیر فطری نظام نے بے شمار مفاسد کو پیدا کیا جس سے خود اس کے پیٹ سے اس کا توڑ یعنی اشتراکی نظام پیدا ہوا۔ اسی کے پیٹ سے ہم نے اس لیے کہا کہ دونوں غیر فطری تحریکوں (سرمایہ داری اور کمیونزم) کے موجد اور بانی یہود ہیں۔ کمیونزم یا اشتراکیت کے بانی شترپن[1] بار اطانی، کارل مارکس[2] لینن[3] ہیں اور یہ تینوں یہودی ہیں (دیکھیے طنطاوی کی تفسیر الجواہر ص ۱۲۹، ج ۲)

ان دونوں یہودانہ تحریکوں نے کل دنیا کو دو بلاکوں میں تقسیم کیا۔ مشرقی اور اشتراکی بلاک اور مغربی سرمایہ دار بلاک دونوں میں اسلحہ سازی کی دوڑ جاری ہے اور ان دونوں نظاموں کی کشمکش سے لاکھوں کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور ہو رہی ہیں جس کے لیے مہلک ترین ہتھیار یعنی ایٹم بم آئن سٹائن یہودی نے ایجاد کیا ہے۔

سرمایہ داری کی طرح کمیونزم کے بانی بھی یہود ہیں

عالم کا یہ مادی فتنہ جس نے دو بلاکوں میں دنیا کو تقسیم کیا اور ان دونوں میں مستمر سرد یا گرم جنگ قائم ہے، یہودی فتنہ ہے۔ اس ملعون قوم نے ان دونوں نظاموں کو تشکیل دی اور اپنے زور قلم سے عالم میں اس

کو مقبول بنایا۔ اب پوری دنیا یہودی چکی کے دو پاٹوں میں (سرمایہ داری، کمیونزم) پسی جا رہی ہے۔ یہ ملعون قوم صرف اس معاشی فتنہ کی علمبردار نہیں بلکہ تمام دینی فتنوں کا اصلی سرچشمہ بھی یہود ہیں۔

عیسائی توحید اور پولوس یہودی

توحید جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصلی دین تھا اس کو پولوس یہودی نے منافقانہ طور پر عیسائی بن کر تثلیث، کفارہ اور الوہیت کی شکل میں تبدیل کیا جس کی وجہ سے اصلی مسیحیت نے بگڑ کر موجودہ صنمیت کی شکل اختیار کی۔ تفصیل کے لیے الجواب الفصیح لما لفقہ عبد المسیح کو دیکھیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بحث سے فارغ ہو کر اب ہم اشتراکی نظام پر بحث کریں گے اور آخر میں اسلام کا معاشی نظام یعنی اعتدالیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے تاکہ صحیح موازنہ کیا جا سکے۔

حصّہ دوم

کمیونزم کا تاریخی پس منظر

اسبابِ معاش اور وسائلِ رزق کی منصفانہ تقسیم کی حد تک کمیونزم نظریات کی جھلک دورِ قدیم میں بھی نظر آتی ہے۔ افلاطون جو چوتھی صدی قبل از مسیح میں گذرا ہے جارج سول اپنی مشہور کتاب "عظماء کے معاشی نظریات" ص۵ پر افلاطون کا معاشی نظریہ نقل کرتے ہیں:۔

"افلاطون حکمران طبقے کے لیے اس سے زیادہ جائیداد پر قابض رہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا جس کی بنا پر ان کا گذارہ ہو سکے۔ ان کے نزدیک جائیداد کی مشترکہ ملکیت کا اصول عام طور پر رائج ہونا چاہیے۔"

ارسطو اپنے پیش رو افلاطون کے مقابلے میں زیادہ مبصر تھا۔ اس نے اپنے مشاہدے سے جو نظریات پیش کیے وہ دورِ جدید کے سائنس دانوں کے نظریات کا ابتدائی پرتو پیش کرتے ہیں۔ ارسطو نے سود پر روپے قرض دینے کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا۔ افلاطون کے برعکس ارسطو کی رائے یہ تھی کہ:۔

جائیداد کی مشترک ملکیت نہ تو ممکن العمل ہے اور نہ ایسے انسانی

طبائع سے کوئی مناسبت ہے۔" (جارج سول کی معاشیات ص۸)

رُومی سلطنت

رومی سلطنت کا شیرازہ جب منتشر ہوا تو تمام یورپ میں جاگیرداری کا نظام قائم ہوا۔ اور جاگیرداروں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا جو پیداوارِ زمین میں حسبِ مراتب حصہ دار تھے اور ہر بڑا جاگیردار چھوٹے جاگیرداروں سے مقررہ حصہ وصول کرتا تھا اور غلاموں اور مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔ اس نظام میں جاگیردار کمزور طبقے پر بے حد ظلم کیا کرتے تھے جس کے ازالے کی کوئی صورت نہ تھی، کیونکہ اقتدار جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا جن کا مفاد مشترک تھا۔

کلیسا کو اگرچہ پورے یورپ پر اقتدار تھا اور انہوں نے دنیوی حکمرانوں کے ساتھ حصولِ اختیارات میں مقابلہ بھی شروع کیا اور سابق دور کے برخلاف کہ روپیہ صرف مبادلہ کا ذریعہ ہے۔ یعنی روپیہ اس لیے ہے کہ اس کو دے کر جنس خرید لیا جائے، نہ یہ کہ خود اس کو جنس بنا کر پیداوار دولت کا ذریعہ قرار دیا جائے۔

کلیسا کا پیشوا کوئی جو قبل ازیں ارسطو کی طرح سود کی مذمت کرتا تھا۔ اس نے یورپی معاشیات میں مندرجہ ذیل صورتوں میں سود وصول کرنے کو جائز قرار دیا۔

۱۔ روپے قرض دینے والا نفع حاصل کرنے کے مواقع سے محروم ہو جائے۔

۲۔ قرضہ دینے والے کو نقصان یا صدمہ پہنچے۔

۳۔ قرض لیا ہوا روپیہ ادا نہ ہو سکنے کی صورت میں نقصان کا خطرہ۔

۴۔ قرض روپے کی ادائیگی کی مدتِ مقررہ سے تاخیر۔

اس مذہبی فتویٰ نے یورپ میں سودی کاروبار کو فروغ دیا جس سے غریب طبقے پر ضرب پڑی۔ پہلے وہ جاگیردارانہ نظام کے بوجھ کے نیچے پس رہے تھے۔ اب سودخواری کا حملہ بھی شروع ہوا۔

صنعتی انقلاب

یورپ میں جب سائنس کی بدولت صنعتی انقلاب آیا، اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے تو جاگیرداروں نے صنعت کو زیادہ نفع بخش سمجھ کر دولت کو کارخانوں پر صرف کرنا شروع کیا اور اس طرح ایک حد تک جاگیردارانہ نظام صنعتی نظام میں تبدیل ہوا۔

یہ نظام برابر غیر متوازن چلتا رہا اور کارخانے کی تیار شدہ اشیاء کے منافع میں مزدور کو صرف قوتِ لایموت ملتا تھا اور اسی کی محنت سے بنائی ہوئی مصنوعات کی باقی سب آمدنی مالکِ کارخانہ ہڑپ کر جاتا تھا اور چونکہ یہی کارخانہ دار حکومت میں صاحبِ اقتدار تھے تو ان کی نفع اندوزی کی حرص کا اثر صرف مزدور طبقے پر نہیں پڑتا تھا، بلکہ من مانے نرخ مقرر کر کے اشیاء صرف لاگت سے بہت زیادہ قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ جس سے مزدوروں کے علاوہ دیگر عوام کی معاشی زندگی بھی متاثر ہوتی تھی۔

مارکس کے استاذ ہیگل نے اس بے انصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور دیگر افراد نے بھی کوشش کی کہ کارخانوں میں تیار شدہ اشیاء کی لاگت سے زیادہ قیمت مالک اور مزدوروں میں برابر تقسیم ہو۔ لیکن اس نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا

تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اب سرمایہ کا پیٹ اتنا پھولا کہ اس سے طبعی طور پر کمیونزم کا بچہ پیدا ہونا ناگزیر ہوا۔

چنانچہ اب اس نظریاتی تحریک نے عملی بلکہ سیاسی تحریک کی شکل اختیار کی ہیگل خود اس فلسفہ کا موجد ہے کہ ہر مثبت ایک دعوےٰ ہے اور ہر نفی اس کا جواب دعوےٰ ہے اور مثبت اور منفی کے بعد تطبیق رونما ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ہیگل کے نزدیک، مادیات، روحانیات، عقائد و اعمال سب پر حاوی ہے۔

سرمایہ داری نے فرد کا حق ثابت کیا اور جماعت کا حق نظر انداز کیا۔ کمیونزم نے شخصی اور انفرادی ملکیت کی نفی کی اور جماعت کو ترجیح دی۔ بقول ہیگل ان دو نظریات متناقضہ کے بعد تطبیقی نظریہ کی ضرورت ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ وہ تطبیق اور اعتدال نظریہ معاشیات اسلام کا ہے، جس کو ہم آگے چل کر تفصیل سے لکھیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

کارل مارکس

یہ جدید اشتراکیت کا سب سے بڑا داعی ہے اور موجودہ اشتراکیت مارکسزم کا دوسرا نام ہے۔ جارج سول کے قول کے مطابق اس کے والدین یہودی تھے۔ ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے۔ ہیگل کی نگرانی میں اس نے ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ اس نے داس کیپٹال یعنی "سرمایہ" نامی کتاب کی پہلی جلد ۱۸۶۷ء میں شائع کی۔ اس کتاب کی دوسری اور تیسری جلد مارکس کی وفات ۱۸۸۳ء کے بعد شائع ہوئی۔

مارکس تنگ دستی میں دن کاٹتا تھا۔ کچھ مالی امداد انجلز دیتا تھا۔ اگرچہ مارکس کی

بہت سی پیشگوئیاں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے متعلق غلط نکلیں لیکن اس نے اپنے نظریات کی اشاعت کر کے ایک بااثر جماعت کو ہمنوا بنایا۔

ان نظریات نے اگرچہ اس کے دور میں ایک عظیم حکومت کی شکل اختیار نہیں کی، لیکن ان نظریات کے ایک دوسرے داعی نے کہ وہ بھی یہودی تھے، ان نظریات کو روس میں ایک کمیونزم حکومت کی شکل دی۔ جس نے دین کی مخالفت کو بھی صرف اس لیے اپنے نصب العین میں شامل کیا کہ برسرِ اقتدار کمیونزم طبقہ نے جس کے تمام ممبران کی تعداد ۳۶ لاکھ سے زیادہ نہ تھی، یہ محسوس کیا کہ دین پر یقین رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کہیں دین پرستوں کی اکثریت انقلاب برپا کر کے ان سے اقتدار نہ چھین لے۔ اس لیے محکمۂ تعلیم اور نشریات کے تمام وسائل کو کام میں لا کر انھوں نے دین کی مخالفت میں پروپیگنڈہ شروع کیا اور کہیں کہیں انھوں نے جبر سے بھی کام لیا تاکہ اگر موجودہ نسل پوری کیمونسٹ نہ ہو تو حکومت کے بے پناہ وسائل نشر سے آئندہ نسل کی تربیت ایسی ہو کہ وہ دین سے بیگانہ ہو کر کمیونزم کے سانچے میں پوری طرح ڈھل جائے اور اربابِ اقتدار کی نظریاتی اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو سکے۔

اگرچہ مزدوروں کی حمایت کے نام سے ان کی حاصل کی ہوئی حکومت میں مزدوروں کے حصہ میں ملک کی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ تین فی صد حصہ آیا۔ باقی پر حکومت قابض ہوئی اور مزدوری کی اجرت میں برائے نام اضافہ بھی کر دیا گیا۔ لیکن اشیاءِ صرف پر حکومت کا قبضہ تھا جن کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا۔ اس طرح ایک طرف اجرت میں

اضافہ کرنے سے گویا مزدوروں کو ایک ہاتھ سے جو دیا وہ دوسرے ہاتھ سے واپس لیا گیا۔

اس کی دلیل دورۂ روس کے بھارتی وفد کے صدر مسٹر ابھائی لال جی کا پارلیمنٹ میں وہ بیان ہے جو نوائے وقت لاہور کی اشاعت ۳ جنوری ۱۹۵۵ء میں درج ہے۔

صدرِ وفد دورۂ روس نے کہا کہ:

"روس میں معیارِ زندگی پست ہے، کیونکہ ایک پاؤنڈ (ڈیڑھ پاؤ) مکھن کی قیمت ۱۲ روپے ہے۔ ایک قمیض کی قیمت ایک سو بیس (۱۲۰) روپے ہے۔ ایک سائیکل کی قیمت سات سو اسی (۷۸۰) روپے ہے۔ اسی لیے کم لوگ سائیکل رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے اسی روپے ماہوار کمانے والے شخص کا گذارہ، روس کے اس شخص سے جو ہزار روپے ماہوار کماتا ہے، اچھا ہے۔"

کمیونزم کی تباہیاں

۱۔ خونریزی اس تحریک کی ابتداء انسان کی تباہی پر رکھی گئی ہے چنانچہ روس میں قیامِ کمیونزم کے لیے انیس (۱۹) لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ بیس (۲۰) لاکھ کو مختلف سزائیں دی گئیں اور پچاس (۵۰) لاکھ کو جلا وطنی کی سزائیں دی گئیں۔ اسٹالین نے کمیونزم کے لیے پانچ کروڑ مسلمانوں کو قتل کیا۔ (کوہستان ۱۲، نومبر ۶۷ء)

۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء میں پیرس کی اتحادی اسمبلی میں چینی نمائندہ نے رپورٹ پیش کی کہ کیمونزم قائم کرنے کے لیے چین نے ڈیڑھ کروڑ زمینداروں کو پھانسی پر لٹکایا۔ (رپورٹ مندرجہ انجام ۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء)

۲۔ معاشی تباہی

اس تحریک کا مقصد انسانوں کو سرمایہ داروں کے ظلم سے نجات دلانا تھا۔ اس لیے کیمونسٹ حکومتوں نے ذرائع معاش پر قبضہ کیا لیکن درحقیقت انہوں نے تمام سرمایہ داروں کو مٹا کر ذرائع معاش کو ایک سرمایہ دار کے ہاتھ میں دے دیا۔ گویا متعدد سرمایہ داروں کو ایک سرمایہ دار میں تبدیل کیا۔ جو کیمونسٹ حکومت ہے۔

متعدد سرمایہ داروں میں عوام کے لیے یہ سہولت تھی کہ اگر ایک سرمایہ دار کی طرف سے ان پر ظلم ہو تو دوسرے سرمایہ دار کی طرف رجوع کریں اور اس کے ہاں نوکری یا مزدوری اختیار کریں۔ لیکن جب سرمایہ دار صرف ایک ہو یعنی حکومت تو عوام ظلم کی صورت میں کہاں جائیں گے؟ سرمایہ داروں کے مظالم کے ازالہ کے لیے عوام عدالت اور حکومت کی طرف رجوع کر کے ظلم کا انسداد کر سکتے تھے۔ لیکن جب واحد سرمایہ دار خود حکومت ہو تو اس کے ظلم سے بچاؤ کی کوئی تدبیر باقی نہ رہی۔ سرمایہ داروں کے مظالم سے نجات کے لیے نشر و اشاعت کے ذریعہ احتجاج اور مظاہروں کی شکل میں عوامی رائے پر اثر ڈال کر ظلم کا ازالہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کیمونسٹ حکومت جو واحد سرمایہ دار ہے، اس میں یہ صورت بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ

ذرائع نشر و اشاعت حکومت کے قبضہ میں ہیں اور ہر احتجاج اور مظاہرہ خلاف قانون ہے۔ ہڑتال کر کے مزدور سرمایہ داروں سے اپنے حقوق منوا سکتے تھے۔ لیکن جہاں روٹی خود حکومت کے ہاتھ میں ہو۔ وہاں ہڑتال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہڑتال کرنے کی صورت میں ہڑتال کرنے والے روٹی کہاں سے کھائیں گے؟ بظاہر اس تحریک کو مزدور تحریک کا نام دیا گیا لیکن مزدوروں کی کمائی میں سے صرف ان کو تین فی صد حصہ ملتا ہے۔ باقی ہر سرمایہ پر کیمونسٹ حکومت قبضہ کرتی ہے۔ (دیکھیے "سرمایہ دار اور اشتراکیت" صفحہ ۵۳)

۳۔ معاشی ترقی میں رکاوٹ
کیمونزم معاشی ترقی کے خلاف ہے

یہ تحریک فطرۃً معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ معاشی ترقی کا مدار شخصی منفعت کا جذبہ ہے۔ معاشی ترقی جوشِ عمل و محنت سے پیدا ہوتی ہے جس کے لیے انسانی فطرت میں محرک اس کی شخصی ملکیت اور شخصی منافع اور فوائد میں اضافہ ہے۔ ہر آدمی فطرۃً یہ چاہتا ہے کہ دوسروں سے زیادہ محنت کر کے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرے اور اپنے املاک میں اضافہ کر دے۔ اگر اس جذبہ کو ختم کیا جائے اور ذرائع معاش سے بذریعہ محنت کمائی ہوئی دولت پر حکومت یا سٹیٹ کا قبضہ ہو، تو تعمیلِ حکم میں آدمی محنت تو کرے گا۔ لیکن یہ محنت اس محنت سے یقیناً کم ہوگی جو جذبۂ اضافہ ملکیت کے تحت ہو خواہ محنت کرنے والے کو حکومت کی طرف سے ضروریاتِ حیات کا انتظام کیوں نہ ہو۔ کیونکہ صرف ضروریاتِ حیات

کا جذبہ اکتساب دولت اور معاشی جدوجہد کا اصلی محرک نہیں، بلکہ اصلی محرک جذبہ اضافہ ملکیت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ نظام نے اس غلطی کا احساس کر کے کمیونزم کے سابق نظریات میں ترمیم کر کے ایک حد تک شخصی ملکیت کو برقرار رکھنے کی اجازت دی۔ غیر فطری تحریکات کا انجام یہی ہوتا ہے۔

۴۔ کمیونزم شرفِ انسانیت کا توڑ ہے

انسان کی اصلی شرافت اس کی حریتِ فکر و عمل ہے اگر یہ حریت نہ ہو تو انسان مقامِ شرفِ انسانیت سے گر کر ایک حیوان بن جاتا ہے۔ حیوانی زندگی کیا ہے۔ حیوان مثلاً گھوڑے بیل کا اپنا اختیار نہیں۔ وہ ہمارے اختیار کے مطابق چلتا ہے۔ جو کام ہم اس سے لینا چاہیں وہی انجام دیتا ہے اور پھر ہم اس کو گھاس دانہ کھلاتے ہیں۔

کمیونزم عوام سے اسی طرح کام لیتا ہے جیسے انسان حیوان سے، اور پھر اس کے روٹی کپڑے کا بندوبست کرتا ہے۔ کمیونزم سٹیٹ کے آگے انسان کے فکر و عمل کی آزادی اور اپنا منشا ختم ہو جاتا ہے اور سٹیٹ کے منشا کو پورا کرنا اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ انسان کی صورت میں حیوان بن کر سٹیٹ کے منشا کی تکمیل کے لیے کام کرتا ہے اور اس کے عوض میں روٹی کپڑا حاصل کرتا ہے۔

کمیونزم نے حقیقی خدا کا تو انکار کیا۔ لیکن وہ اسٹیٹ اور حکومت کے چند با اقتدار افراد کو خدا بنانے کی تلقین کرتا ہے جو حقیقی خدا سے بغاوت اور اپنے جیسے عاجز مصنوعی

خدا کی اطاعت گذاری کی ایک خود ساختہ شکل ہے۔ ان دونوں خداؤں میں بڑا فرق ہے اصلی خدا جان اور روزی دیتا ہے اور مصنوعی خدا نان دے کر جان چھینتا ہے۔ جان سے مراد شرفِ انسانیت ہے

آں خدا نانے دہد جانے دہد ‏ ‏ ‏ ‏ ایں خدا نانے دہد جانے برد
آں خدا یکتا است ایں صد پارہ ‏ ‏ ‏ ‏ آں ہمہ چارہ وایں بے چارہ

کمیونزم کی بنیاد نفی پر ہے۔ اثبات پر نہیں۔ حالانکہ صرف نفی سے تسکینِ قلب نہیں ہوتی۔ جب تک اصلی خدا کا اثبات نہ ہو جو دلوں کے لیے سہارا بن سکے۔ اگر یہ سہارا اٹھ جائے تو انسانِ ضعیف کی پر آلام و مصائب زندگی کے لیے کوئی سہارا باقی نہیں رہتا کمیونزم کا یہ حال ہے کہ بقولِ اقبالؒ :۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ ‏ ‏ ‏ ‏ لا سلاطین لا کلیسا لا الٰہ
فکرِ او در تند باد لا بماند ‏ ‏ ‏ ‏ مرکبِ خود را سوئے الّا نراند

اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو کمیونزم کے یہ تین منفی ستون بھی غلط ہیں۔ "لا الٰہ" میں اصلی خدا قادرِ مطلق کا تو انکار ہے لیکن کمیونزم میں حکمران جو کہ عاجز انسان ہے۔ اس کی خدائی کا اقرار ہے۔ یعنی ذاتِ قوی کی خدائی سے انکار اور ضعیف، عاجز اور فانی کی خدائی کا اقرار ہے۔ اسی طرح "لا سلاطین" میں چھوٹے بادشاہوں کا انکار ہے۔ لیکن "سٹیٹ حکمران" ایک بڑے سلطان کی سلطانی کا اقرار ہے اور بقول چھوٹے سانپوں کو ہٹا کر ایک بڑے اژدہا کو ان کی جگہ مسلط کرنے کا اقرار ہے۔ "لا کلیسا" میں مذہب

کا انکار ہے یعنی اصلی اور خدائی مذہب کا تو انکار ہے لیکن خود ساختہ مصنوعی انسانی مذہب کا اقرار ہے جو خود کمیونزم کے اصول ہیں جن کو انہوں نے مذہب سے بڑھ کر اپنے لیے لائحہ حیات بنایا ہے۔

۵۔ کمیونزم فطرتِ انسانی کے خلاف جنگ ہے

اشتراکی مفکرین کے نظریات کا خلاصہ افراد میں مصنوعی مساوات پیدا کرنا ہے۔ اگرچہ یہ بھی صرف پروپیگنڈہ ہے۔ حقیقت اس کے خلاف ہے۔

"رسالہ فریڈم فرسٹ" کی رپورٹ مندرجہ "پاسبان" کوئٹہ ۲۰ دسمبر ۵۲ء ۱۹ میں ہے کہ:

"اسٹالین کی سالانہ آمدنی آٹھ لاکھ روبل یعنی تقریباً نو لاکھ روپیہ پاکستانی ہے اور اشیائے ضرورت اس کو اصل لاگت سے اسّی فی صد کم قیمت پر ملتی ہیں۔ دیگر اخراجات سرکاری ہیں۔"

کیا یہ رعایتیں روس کے تمام افراد کو حاصل ہیں؟ یہ روسی حکمران مدعیِ مساوات کا حال ہے لیکن اسلامی خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سالانہ تنخواہ عوام کے اضافۂ تنخواہ کے اصرار کے باوجود دو ہزار درہم یعنی پانچ سو روپیہ سالانہ پاکستانی سکہ سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

سلطان عالمگیرؒ خزانہ کو عوام کا حق سمجھ کر تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ حکومتی مصروفیات سے فارغ وقت میں قرآن نویسی سے اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ لیکن اس

مصنوعی غیر واقعی دعوے کو اگر فطرت کے اصول پر جانچا جائے تو یہ اصولِ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔

رزق اور مال دو ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک قوتِ فکریہ یعنی دماغی قوت سے۔ دوم قوتِ عملیہ یعنی بدن کی طاقت سے۔ اہلِ قلم، وکلاء، وزراء، مدبرین وغیرہ ذہنی اور دماغی قوت سے مال حاصل کرتے ہیں اور مزدور، کسان وغیرہ بدنی قوت سے خالقِ کائنات نے افرادِ انسانی میں یہ دماغی اور بدنی دونوں قوتیں مساوی نہیں رکھیں، بلکہ کسی حکمت کی وجہ سے متفاوت رکھی ہیں۔ نہ سب انسان ذہن، عقل اور دماغی قوت میں برابر ہیں اور نہ ہی بدنی قوت میں۔ تو جب علّتِ اکتسابِ رزق میں فطرۃً تفاوت ہے تو اس کے آثار و نتائج میں بھی ضرور تفاوت ہوگا۔ کوئی زیادہ مال کماتا ہوگا، کوئی کم، یہی وجہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں دیگر فطری امور کی طرح انسانی افراد میں مالی تفاوت برابر قائم رہا ہے۔ کیونکہ وہ فطرۃً ان دو عملی اور بدنی قوتوں کے تفاوت کا نتیجہ ہے۔

بسا اوقات ایک باپ کے دو بیٹے آبائی جائیداد آپس میں برابر تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن چند سال کے بعد ایک بیٹا اصل سرمایہ کھو دیتا ہے اور دوسرا آبائی سرمایہ میں اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ دونوں بیٹوں کے فطری تفاوت نے نتائج کا یہ تفاوت پیدا کیا اور وراثتی مساوات کو توڑ دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مصنوعی معاشی مساوات فطرت کے ساتھ نہیں چل

سکتی۔ فطرت جلد اس کو توڑ دیتی ہے۔ بنا بریں اشتراکیت کی مصنوعی مساوات فطرتِ انسانی کے خلاف جنگ ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	دیکھو کہ کس طرح انسانوں کے
عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (قرآن)	رزق میں ہم نے تفاوت رکھا ہے

۲۔ اشتراکیت انسانی اخوت کے خلاف جنگ ہے

اشتراکیت اور کمیونزم انسانوں کے دو طبقوں میں دوامی عداوت اور دشمنی کا بیج بوتا ہے اور ایک طبقہ کو دوسرے سے لڑاتا ہے جس سے انسانی اخوت اور معاشرہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ انسانی افراد کی محبت باہمی، عداوت باہمی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس طبقہ کو قوت حاصل ہوتی ہے، وہ دوسرے طبقہ کے خون بہا دینے کو عملِ نیک قرار دیتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی انسانی آبادی کو ان دو خلافِ فطرت نظریات (سرمایہ داری اور کمیونزم) نے دو عظیم بلاکوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر بلاک اسلحہ سازی کی دوڑ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس ایٹمی دور میں ان دونوں بلاکوں کے درمیان جنگ ہو جو ناگزیر ہے تو انسانوں کی اکثر آبادی خاکستر کا ڈھیر ہو جائے گی اور صدیوں کی تعمیر ان دونوں غیر فطری نظریات کی پیدا کردہ جنگ کی وجہ سے خاک کا تودہ بن کر رہ جائے گی۔

★

کمیونزم اور سوشلزم

مذہب اور اخلاق کے آئینہ میں

۱۔ سوشلزم اور مارکسیت اس سے قائم ہوتا ہے کہ انسان کو مذہب سے لڑایا جائے۔ چنانچہ واٹ کمیونزم از ویب صفحہ ۱۴۲ میں ہے کہ:

”کمیونزم کا ممبر اس شخص کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا جو صدقِ دل سے صاف صاف اس بات کا اعلان نہ کر دے کہ وہ دہریہ ہے۔ یعنی منکرِ خدا ہے۔“

۲۔ اینجلز لکھتا ہے کہ:

”ہماری پارٹی طبقہ دار شعور رکھتی ہے اور مزدوروں کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ ایسی پارٹی مذہبی اعتقادات سے پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی۔ ہمارا ایک بنیادی مقصد ہے کہ مذہبی فریب خوردگی کو دور کیا جائے۔“ (اینجلز صفحہ ۱۵)

۳۔ مذہبی فریب خوردگی سے نجات دلانے کے لیے خلافِ الوہیت (خدا) سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا نصب العین اس کے الفاظ میں یہ تھا کہ:

”ہم نے آسمانی زاروں کو تو عرش سے اتار پھینکا ہے۔ جس

طرح ہم نے اس زمین کے زاروں کو اتار پھینکا ہے۔" (حاشیہ اشتراکیت اور اسلام، مسعود عالم ص۸)

۴۔ مارکس نے مذہب کے انفرادی معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہمیں قدم آگے بڑھا کر انسانی ضمیر کو مذہب کے اقتدار سے آزاد کرانا ہے۔"

۵۔ "مذہب پر تنقید علمِ تنقید کا مبدء ہے۔" (مارکس سوشلزم نمبر ص۱۹۲)

۶۔ "مذہب عوام کے حق میں افیون کا اثر رکھتا ہے۔" (بحوالہ سابق)

۷۔ "مذہب ازمنہ قدیمہ کی نظامی غلامی کی بازگشت ہے۔" (کمیونسٹ مینوفیسٹو کی تشریح دفعہ ۵۵ از ریزنیوف)

۸۔ "ضابطۂ اخلاق جو انسانی سماج سے باہر لیا گیا ہے۔ ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، یہ ایک ڈھونگ ہے۔ ہمارا ضابطۂ اخلاق طبقاتی تصادم کے مفاد کا تابع ہے۔" (لینن)

ان مختصر جوابات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ سوشلزم صرف ایک معاشی تحریک نہیں، بلکہ ایک جدید مذہب ہے جو تمام ادیانِ سابقہ اور الٰہی تعلیمات اور اخلاقی اقدار اور خود سرچشمۂ دینِ حق یعنی ذاتِ خداوندی کے خلاف ہے، اور کامریڈوں کی زندگی کی راہ میں سے ہر رکاوٹ کو دور کرنا اس دینِ جدید یا دینِ یہودی کا مقصد ہے۔

"دینِ سوشلزم جو دشمنِ انسانیت ہے، اس کے بانی شوتپن ہار، مارکس و لینن ہیں جو یہودی تھے اور جن کا قول تھا کہ ہم نے بے زبان حیوانات پر تو سواری کی، اب ہم نے اس زمانے میں انسانوں کو سواری بنا دیا، جن کو حیوانات کی طرح استعمال کریں گے۔" (طنطاوی تفسیر الجواہر ج۲ ص۱۲۵)

تمام انقلابیوں کے درپردہ یہی یہودی تھے۔ اب سوشلزم پرستی کا خلاصہ تمام بشری تاریخ اور تعلیماتِ آسمانی اور خود خدا سے کٹ کر ایک مغضوب یہودی قوم کے تین افراد کے بنائے ہوئے لائحہ حیات یا دین سے اپنی زندگی کو وابستہ کرنا ہے، باقی ہم نے سوشلزم کے متعلق جو کہا ہے کہ وہ دین ہے، یہ بات غیر تحقیقی نہیں۔ بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ڈگلس ہائیڈ نے لکھا ہے کہ:

"اشتراکی کارل مارکس اور اینجلز کو وہ درجہ دیتے ہیں جو صحفِ سماویہ کو دیا جاتا ہے۔ اس طرح چین میں ماؤزے تنگ کی لال کتاب کی تلاوت کرتے کرتے ہوائی جہاز اتارتے ہیں۔ یہ ان کے مذہبی جذبے کا اظہار ہے۔"

اس لیے والٹیر نے کہا:

"اگر خدا نہیں تو ہمیں ایک خدا بنانا پڑے گا۔"

یہ وہ حاجت مصنوعی خدا ہے جو حقیقی خدا کی جگہ سوشلزم کے پرستاروں سے پجوایا جاتا ہے۔

سوشلزم، مزدور اور کاشتکار نوازی کے آئینہ میں

سوشلزم تحریک تبلیغی کم اور
جبری زیادہ ہے۔ اس لیے
اولاً اس تحریک کے لیڈر مزدور اور کاشتکار کی خوشحالی کا نعرہ لگاتے ہیں جب
ان کو اپنے ساتھ ملا کر ایک طاقتور جماعت وہ پیدا کر لیتے ہیں تو ان کے ذریعہ حکومت
وقت کو الٹ دیتے ہیں اور ان کی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے نام پر اپنی
حکومت قائم کر لیتے ہیں چونکہ اس دینِ جدید میں اخلاق اور کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

جیسے کہ ہم نے بیان کیا تو حکومت پھر زمین کا اکثر حصہ کسانوں اور کاشتکاروں سے
چھین کر اجتماعی کاشت کے نام پر اپنے قبضے میں کر لیتی ہے اور برائے نام چند ایکڑ بطور
شخصی ملکیت کاشتکاروں کے حوالہ کر دیتی ہے اور اگر کاشتکار زمین چھیننے میں مزاحمت
کرتے ہیں تو ظالمانہ طریقے سے ان کا خون بہایا جاتا ہے۔ گویا بعد از قیام سوشلزم حکومت
ان کی جنگ بجائے سرمایہ داروں کے کاشتکاروں سے ہوتی ہے۔ جو تھوڑی زمین جو کاشتکاروں
کے پاس رہ جاتی ان کی کل پیداوار حکومت ان سے ارزاں قیمت پر خرید لیتی ہے اور پھر
جب ان کو ضرورت ہوتی ہے تو وہی پیداوار ان پر گراں قیمت پر فروخت کر دیتی ہے۔
اسی طرح دیگر ضروریاتِ حیات جن پر حکومت کا قبضہ ہوتا ہے، حکومت ان پر عام نرخ
سے گراں نرخ پر فروخت کرتی جن سے ان کی معاشی حالت اور معیارِ زندگی نہایت پست
ہو جاتی ہے۔

سوشلزم کا مزدور

مزدوروں کو سوشلزم اور اشتراکی حکومت کارخانوں میں حیوانات

کی طرح کام پر لگا دیتی ہے۔ ان کی محنت سے جس قدر پیداوار حاصل ہوتی ہے، ان پر حکومت
کا قبضہ ہوتا ہے اور انہی پر مصنوعات کو من مانی قیمت پر فروخت کرتی ہے۔ بظاہر مزدوروں
کی اجرت دیگر ملکوں سے معمولی طور سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے تاکہ پروپیگنڈے کا
سامان ہاتھ آئے۔ لیکن اسی حاصل کردہ اجرت سے وہ اشیاءِ ضرورت خریدتے ہیں
جن پر حکومت کا قبضہ ہے اور انہی کی محنت سے وہ بنی ہوتی ہیں تو اس قدر
گراں قیمت پر حکومت ان پر وہ اشیاء فروخت کرتی ہے۔ اس طرح حکومت نے
مزدوروں کو ایک ہاتھ سے جو کسی قدر زائد اجرت دی تھی اس کا ڈبل بلکہ بعض اوقات
ڈبل سے زیادہ واپس حکومت کے پاس آجاتی ہے۔ گویا جو ایک ہاتھ سے دیا دوسرے
ہاتھ سے واپس لے لیا۔

پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ روس میں عام صرف کی اشیاء کم بنتی ہیں اور بڑی
بڑی مشینیں یا آلاتِ جنگ زیادہ تیار ہوتے ہیں۔ اس لیے عام ملکوں سے
بلکہ غیر ترقی یافتہ ملکوں کی نسبت بھی روس میں اشیاءِ صرف کی یافت کم ہے یہی
وجہ ہے کہ بیرونی ممالک میں جاپان وغیرہ ممالک کی نسبت آپ روسی ضروریات
عامہ کی چیزوں کو کم پائیں گے۔

سوشلزم مساوات کے آئینے سے

بظاہر سوشلزم ممالک مساوات کے مدعی
ہیں اور یہ کہ وہاں کوئی طبقاتی فرق نہیں،
لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ شخصی ملکیت بری چیز ہے

لیکن واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا امور کے لیے ہم سوشلزم مطبوعہ ۱۹۶۶ء کے چند حوالہ جات پیش کرتے ہیں:۔

۱۔۔۔ روس کا کل رقبہ ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ مربع میل ہے جس میں صرف ۶۰ لاکھ مربع میل پر روسی آباد ہیں۔ باقی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ پر غیر روسی آباد ہیں باشندگان روس کی کل تعداد ۲۲ کروڑ ہے جس میں دس کروڑ روسی ہیں۔ باقی سب غیر روسی ہیں۔ جن میں ۵ کروڑ قتل سے بچے ہوئے مسلمان ہیں۔ محنت اور فوجی خدمت کا کام غیر روسیوں سے لیا جاتا ہے۔ غیر روسیوں کو ملک کے دور دراز علاقوں میں محنت کے لیے پھیلا دیا گیا ہے اور اعلیٰ عہدے سب روسیوں کے پاس ہیں جس سے دعویٰ مساوات کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

۲۔۔۔ روس میں زرعی عمدہ زمین کی ساڑھے اٹھانوے فیصد ۹۸½ پر اجتماعی کاشت کے سلسلے میں حکومت کا قبضہ ہے اور صرف ڈیڑھ فی صد کسانوں کی ملکیت ہے۔ لیکن اس شخصی زراعت کی آمدنی روس کی تمام آمدنی کی ۲۲ فی صد اور اجتماعی زراعت کی آمدنی کل روس کی زرعی آمدنی کا ۷۸ فی صد ہے جس سے فطری شخصی ملکیت کی نفع بندی اور برتری ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کل رقبہ میں لمبے چوڑے دعووں کے باوجود کسانوں کے ہاتھ میں زمین صرف ڈیڑھ فی صد ہے۔ باقی ان سے بزور چھینی گئی ہے۔

اسی کتاب میں تصریح ہے کہ کسانوں سے اجتماعی کاشت کے نام پر جو زمین چھینی گئی، اس میں ایک کروڑ انسان قتل ہوئے اور اسٹالین نے خود گذشتہ جنگ عظیم کے موقع پر مالٹا کانفرنس میں چرچل سے کہا کہ:۔

"اس جنگ کے اتلاف جان سے ہم نے اجتماعی کھیتوں کے قبضے کے وقت جانوں کی زیادہ قربانی دی۔"

۳۔۔۔ غیر روسیوں کے روس کے جس قدر رقبے پر سکونت ہے، اس کا رقبہ ۹۵ لاکھ کیلومیٹر ہے جو امریکہ کے کل رقبے سے زیادہ ہے کیونکہ امریکہ کا رقبہ ۹۳ لاکھ کیلومیٹر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی کمائی خود ان کے کام آتی ہے اور زیادہ روسیوں کے ہاتھ آتی ہے۔

۴۔۔۔ عوام ہوشربا گرانی کے شکار ہیں۔ بھارتی وفد جس کا صدر رکتو رام بھائی لال جی تھا جب روس کے دورے سے واپس آیا تو اس نے بھارتی پارلیمنٹ میں بیان دیا جو اخبارات میں چھپ گیا کہ:۔

"روس میں معیار زندگی پست ہے۔ ایک پاؤنڈ مکھن کی قیمت ۲۱ روپئے ہے اور ایک قمیص کی قیمت ۱۲۰ روپیہ، ایک سائیکل کی قیمت ۸۰۰ روپیہ ہے۔ ہندوستان کا وہ ملازم جس کی تنخواہ اسی ۸۰ روپیہ ماہوار ہو، روس کے مزدور سے خوش حال ہے جس کی تنخواہ ایک ہزار ماہوار ہو۔" (نوائے وقت ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء)

۵۔ مساوات کا یہ حال ہے کہ اسٹالن کی سالانہ تنخواہ ۸ لاکھ ۲۰ ہزار روبل تقریباً نو لاکھ پاکستانی روپئے تھی اور تیس کوٹھیوں اور چار موٹروں کے لیے ایک لاکھ روبل تقریباً سوا لاکھ کی رقم الگ مقرر تھی اور تمام اشیاءِ صرف کو وہ ان اشیاء کی لاگت سے اسّی فی صد کم پر خریدتا تھا۔ (رسالہ فریڈم فرسٹ، مندرجہ پاسبان کوئٹہ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۲ء)

لیکن نور الدین زنگی بادشاہِ اسلام جس نے متحدہ یورپ کو شکست دی تھی اس کا کل ترکہ جس میں دو دو کانیں تھیں جس کا کرایہ تیس دینار یعنی ۵۰ روپے ماہوار پاکستانی سکے کے برابر تھا۔ جہاد کے لیے اپنا گھوڑا نہ تھا، عاریتاً لیتا تھا اور جہاد سے واپس ہو کر مالک کو واپس کر دیتا تھا۔

آن مسلمانان کی میرے کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

انسانی حرّیت اور سوشلزم

حرّیتِ انسانی کی بنیاد شرافت ہے۔ حیوانات اس شرافت سے محروم ہیں۔ آزاد انسان ان سے کام لیتا ہے اور گھاس کھلاتا ہے۔ سوشلزم تحریک شروع میں کسانوں اور مزدوروں کی جماعت سے سب کچھ کراتی ہے، لیکن جب حکومت قائم ہو جاتی ہے تو اس سوشلزم حکومت کا پنجہ زندگی کی گہرائیوں میں اس قدر گڑھ جاتا ہے کہ عوام کے افکار و عقائد سب لیڈرانِ سوشلزم کے خیالات میں گم ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ ان سے محنت لی جاتی ہے اور لیڈر جیسا چاہتے ویسا کھانا کھلاتے ہیں۔ ان پر اگر ظلم کے پہاڑ توڑے

جارہے ہوں تو وہ اف نہیں کر سکتے کیونکہ نہ تحریر کی آزادی نہ تقریر کی، نہ اجتماع کی اور نہ جلوس کی، ہڑتال تو بڑی چیز اور وہ ایسا کب کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی ضروریات کی اشیاء حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔ پولیس حکومت کے ہاتھ میں، تعلیم حکومت کے ہاتھ میں، خورد و نوش کا سامان حکومت کے ہاتھ میں۔ ایسا سمجھو کہ سوشلزم ممالک کا وسیع رقبہ ایک وسیع جیل خانہ ہے اور چند کامریڈ اس کے جیلر ہیں۔

ایم۔ وائی اشتراکی ۱۹۳۶ء میں لکھتا ہے کہ:

"روس میں عام مزدور کی ماہوار تنخواہ ۱۱۰ سے ۴۰۰ روبل تک ہے روبل تقریباً سوا روپے پاکستانی ہے۔ درمیانہ افسر تین سو ماہوار سے ایک ہزار روبل تک۔ اونچے افسر ڈیڑھ ہزار سے دس ہزار ماہوار تک، اور بہت اونچے بیس ہزار سے تیس ہزار ماہوار روبل تک تنخواہ لیتے ہیں؛ جو اکثر روسی ہیں۔ سٹالین نے مزدوروں کی تنخواہ میں اضافے کے جواب میں کہا، مارکسزم مساوات کا دشمن ہے۔" (مارکسزم نمبر ص۱)

یہ حال ہے مزدور اور کسانوں کا۔

اسی غیر فطری نظام کا نتیجہ ہے کہ روس اور چین دونوں کے تجربے نے ثابت کیا کہ:

"سوشلزم کے اس اصول پر عمل کرنا کہ تمام زمین پر اجتماعی کاشت ہو ناممکن العمل ہے اور شخصی ملکیت میں ہاتھ ڈالنا زراعت کو تباہ کرنا ہے

بلکہ سوشلزم جذبۂ کار کے جوشش کو ختم کرتا ہے۔ اس لیے یہ نظام صنعتی اور زرعی پیداوار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔" (دیکھو سرکاری رپورٹیں روس اور چین کی مندرجہ سوشلزم نمبر از ص۲۱ تا ص۴۲)

بقول اقبال مرحوم ؎

اگر تاجے کئی جمہور پوشد — ہماں ہنگامہ ہا در انجمن است
ہوس اندر دل آدم نمیرد — ہماں آتش میان مرزغن است

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مادی اور سوشلزم نظام حیات میں جب تاریخی ارتقاء ایک طے شدہ چیز ہے۔ تو سوشلزم کے لیے پچاس سالہ محنت اور خون خرابہ اور قربانیوں کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ طے شدہ ارتقاء کا ظہور لازمی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب بیرونی عامل کا جس کو مشیت الٰہی کہا جا سکتا ہے اسی کا شعبۂ جو اس جہان کی ہر تبدیلی کا محرک ہے اور یہ ایک مادوما الطبیعاتی عمل ہے۔

بہر حال سوشلزم کے باطن سے جو بھی واقف ہو گا اس کو ہر غیر سوشلسٹ کا مزدور اور کسان آزاد اور خوش حال نظر آئے گا۔ پروپیگنڈے کی ساحری سے لاشعوری طور پر کچھ لوگ ضرور اسوۂ روس و چین کے شیدائی بنتے جا رہے ہیں لیکن نتائج کے

موازنہ کے بعد حقیقت کھل جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے کھو یا بہت کچھ جاتا ہے اور ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ واللہ الھادی الی سبیل الرشاد۔

اشتراکیت اس لامحدود جبر و تشدد کا نام ہے کہ نہ کوئی قانون اس پر حد بندی کر سکتا ہے اور نہ اخلاق جبری محنت شروع میں مرد اور عورت دونوں سے لی جاتی رہی اور اپنے اصلی وطن سے اکھیڑ کر لاکھوں نہیں کروڑوں خاندانوں کو بہ جبر دور دراز علاقوں میں محنت لینے کے لیے دھکیلا گیا۔

پروداکی ۲۶ جولائی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں اس قانون کا اعلان کیا گیا کہ:

" سٹرائک کرنے والوں کو ۱۵ سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ملازم کی ۲۰ منٹ محنت کے لیے تاخیر سے پہنچنے کی سزا بھی ۴ ماہ کی جیل ہے۔ اس طرح انھوں نے تشدد کو ایک مقدس عمل قرار دیا لینن نے صاف اعلان کیا کہ مت سمجھو کہ میں انصاف کی تلاش میں ہوں۔ اب انصاف کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔" (بحوالہ لیا لیڈ یانگ ص۲۱، ۲۲)

اشتراکیت کی اشاعت نتیجہ تشدد ہے نہ نتیجہ صداقت

اشتراکیت کی بنیاد چونکہ بغض وعداوت اور طبقاتی جنگ پر ہے۔ اس لیے اس نظریہ کو قبول حاصل ہوا، نہ اس وجہ سے کہ اس نظریہ میں کوئی صداقت وافادیت ہے۔

۱۔ غریبوں پر تشدد

شروع میں علمبرداران اشتراکیت نے کسانوں اور مزدوروں کو سبز باغ دکھایا اور ان کو ارباب اقتدار، امراء طبقہ کے اور ان کے دلوں میں نفرت وعداوت بھر کر ان کے خلاف بھڑکایا۔ چونکہ ہر ملک میں غریب طبقے کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اکثریت نے ان کے وعدوں پر اعتماد کر کے ان کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے معمولی اقلیت اور عظیم اکثریت کے درمیان مقابلہ شروع ہوا۔ ایسے مقابلے کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ اکثریت کامیاب ہو۔ اس لیے یہ کسی صداقت کا نتیجہ نہ تھا۔

اشتراکیت کو جب حکومت حاصل ہوئی اور اقتدار ہاتھ میں آیا۔ چونکہ اس جدید انقلاب کے اقتدار کو مضبوط کرنے میں بھی کافی وقت صرف ہونے کی ضرورت تھی۔ اس وقت اس تحریک کی اصلی حقیقت اور اشتراکی قیادت کے وعدوں کی ایفاء کی حقیقت عوام پر نہ کھل سکی۔ جب اشتراکی حکومت مستحکم ہوگئی تو اشتراکیوں نے دوسری جنگ کسانوں سے زمین اور مویشی چھیننے کے لیے خود کسانوں سے لڑی اور جیسے کہ ہم نے نقل کیا ہے کہ اسٹالین کے اقرار کے مطابق ایک کروڑ کسانوں کو قتل کیا گیا جو سوشلزم

مطبوعہ ۱۹۶۷ء کے صفحہ ۴۵ پر درج ہے۔

یہ اسٹالین کا اپنا اقرار ہے۔ ممکن ہے کہ اصل تعداد اس سے بہت زیادہ ہو اور اشتراکیت منوانے کے لیے اس کے علاوہ روس نے ۱۹ لاکھ افراد کو موت کی سزا دی۔ ۲۰ لاکھ افراد کو جلاوطن کیا گیا اور پچاس لاکھ کو مختلف سزائیں دیں۔ (دیکھئے حوالہ کے لیے کتاب سرمایہ داری اور اشتراکیت ص۵۲)

۲۔ زمینداروں پر تشدد

چین کے نمائندہ نے اتحادی اسمبلی منعقدہ ۳ دسمبر ۱۹۵۱ء پیرس میں رپورٹ پیش کی کہ:

"اشتراکی چین نے ڈیڑھ کروڑ زمینداروں کو پھانسی پر لٹکایا۔" (دیکھو رپورٹ مندرجہ انجام ۵ دسمبر ۱۹۵۱ء)

کوہستان ۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء میں ہے کہ:

"اسٹالین نے کیمونزم کے قیام کے لیے پانچ کروڑ مسلمانوں کو قتل کیا۔ یہ تشدد صرف مال چھیننے کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ذاتی عقیدہ اور دین بھی اس تحریک کے علمبرداروں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔"

۳۔ دینی عقیدہ پر تشدد

چینی اخبار تن بات باؤ ہانگ کانگ ۱۱ نومبر ۱۹۶۷ء اور ہفتہ وار ایشیا لاہور ۲۴ دسمبر ۱۹۶۷ء میں چینی صدر ماؤزے تنگ کے پیروؤں اور چینی لیڈروں کا ایک پیغام چینی مسلمانوں کے نام درج ہے۔ جس کا متن یہ ہے:-

"اے مسلمانو! گوش و ہوش سے سن لو۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی کہ تم اپنے چہرے پر دین کا نقاب ڈال سکو ورنہ تمہیں جلاوطن کر دیں گے یا نیست و نابود کر دیں گے۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ تم گائے کا گوشت کھاؤ اب تمہیں خنزیر کا گوشت کھانا چاہیے۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ تم اپنے اوقاتِ نماز میں ضائع کرو۔ تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ قرآن کی تلاوت کرو جسے تم مقدس سمجھتے ہو۔ اے مسلمانو! پورے غور سے سنو۔ تمہیں اپنی مساجد اور مدارس کو ڈھانا ہوگا۔ اپنی اسلامی تعلیمات کو توڑنا ہوگا۔ نماز کو خیرباد اور ختنے سے اجتناب کرنا ہوگا۔"

اس میں شک نہیں کہ چین جمہوریۂ پاکستان کا دوست ہے، روس بھی دوست ہے اور بالخصوص سابق تجربہ کی بنا پر چین کی دوستی قابلِ اعتماد دوستی ہے۔ لیکن دوستی کا تقاضہ صرف اس قدر ہے کہ ہمارے ان کے درمیان اقتصادی، تجارتی، فنی تعاون ہو اور ہمارا سب پڑوسی حکومتوں سے یہی طرز ہونا چاہیے ان سے مادی اشیاء حسبِ ضرورت درآمد کریں گے اور ان کو بھی اپنی اشیاء برآمد کریں گے۔ لیکن ان کے خیالات اور افکار کی درآمد پاکستان کی تباہی اور انتشار کا موجب ہوں گے اور ایسے لٹریچر سے پاکستان کی پرسکون فضا درہم برہم ہو کر پاکستان

کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گا اور ان افکار کی اشاعت سے ایسی ذہنیت تیار ہو گی جو اسلام کی بنیادی اصول، اخلاقی اقدار پر ضرب لگانے سے دریغ نہیں کرے گی اور ملک کا امن و امان درہم برہم ہو جائے گا۔

ہمارے چودہ سو سال کا قیمتی ورثہ جس کے تحفظ کے لیے ہم نے ماضی میں بھی جان مال کی بے مثال قربانیاں دیں اور تاسیسِ پاکستان کے وقت بھی دی اس کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ ہم جس قدر اشتراکیت کے خلاف ہیں اسی قدر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے بھی خلاف ہیں۔

میں نے اس کتاب میں امریکہ اور یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کے تباہ کن نتائج تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ان دونوں نظاموں کی تباہیوں سے بچنے کے لیے اصل علاج اسلام کے معاشی نظام کو رائج کرنا ہے جو میں نے اس کتاب میں اس کا خاکہ پیش کیا ہے۔

یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ اشتراکیت میں افادیت اور انسانی زندگی سے ہم آہنگی موجود نہیں بلکہ یہ نظام سراسر خلافِ فطرت ہے کارل مارکس اور شوپن ہار یہودیوں کی فساد انگیز تحریک ہے جس کو فطرتِ انسانی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ صرف جبر و تشدد اور زور کے سہارے سے قائم ہے ورنہ آج اگر سوشلسٹ ممالک میں آزادانہ استصواب رائے ہو تو چند کامریڈوں کے بغیر اس کے حق میں کوئی ووٹ نہیں دے گا۔

اس وقت جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ راہِ اعتدال ہے۔ باقی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام دونوں غیر فطری اور جذباتی ہیں۔ اس لیے ان میں تجربات کے بعد روز بروز تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ لیکن بالفرض اگر دونوں نظریات رکھنے والوں کے دعوؤں کو اگر سچ بھی مان لیا جائے تو بھی مسلمان کے لیے ان کو اختیار کرنا اور دینِ فطرت کی ابدی صداقتوں کو ترک کرنا اور اپنے تاریخی ورثہ کو خیرباد کہہ کر ماضی سے منقطع ہونے میں مسلمانوں کی موت ہے اور طاقتور بلاکوں میں سے کسی ایک کا ضمہ اور دُم بن جاتا ہے جو ہماری خودی کی موت ہے۔

مغربی یا مشرقی بلاک میں ادغام موت ہے

بقولِ اقبال مرحوم:۔

دین ہاتھ سے دیکر اگر آجائے حکومت ـــــ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

لیکن یہاں تو آجائے حکومت کا سوال ہی نہیں بلکہ آئی ہوئی حکومت کے چلے جانے کا خطرہ ہے۔ ہماری تہذیب مغربی تہذیب میں بڑی حد تک مدغم ہو گئی ہے۔ اب اگر افکار بھی اشتراکی ہو جائے اور تہذیب تو پہلے سے مغربی ہو چکی ہے تو مسلمانوں کی ظاہری و باطنی دونوں خوبیوں کا خدانخواستہ خاتمہ ہو جائیگا۔

* * *

اشتراکی نظام اور انسانی فطرت

اشتراکیت کا پورا نظام چونکہ خالص جذباتی نظام ہے۔ اس لیے یہ نظام سراسر عقل اور انسانی فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غیر فطری امر کو انسانی جبر و تشدد کے بغیر قبول نہیں کرتا۔ کمیونسٹ ممالک سے اگر ایک لمحے کے لیے بھی جبر و تشدد ہٹ جائے تو وہاں کے عوام اس نظام کو توڑ کر اپنی اصلی فطرت پر آجائیں گے۔ لہٰذا یہ تحریک قہری و جبری تحریک ہے جس کو تشدد نے عوام پر مسلط کر دیا ہے۔ جس وقت آہنی قلعہ ٹوٹ جائے گا تو یہ تحریک پارہ پارہ ہو جائے گی۔

۱۔ اختصاصِ فطری کیخلاف جنگ

اشتراکی نظام جبری ہے اور اختصاصی نظام فطری ہے یعنی انسانی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ آزاد ہو کر جائز طریقے سے اپنے لیے رزق کمائے اور اس کی کمائی ہوئی دولت مساکین کے حقوق کی ادائیگی کے بعد اس کی ذات اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ سے مختص ہو۔ یہ اختصاص فطرتِ انسان میں موجود ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں کہ وہ اختصاصی جذبے سے خالی ہو۔

اب اشتراک اس اختصاصِ فطری کی ضد ہے کہ خاص چیز کو عام اور مشترک قرار دیا جائے۔ اس کی مثال بعینہٖ پانی کی طرح ہے کہ پانی کی فطرت سرد ہونا

ہے۔ اب اگر پانی کو آگ پر رکھا جائے یا دھوپ میں رکھا جائے تو اس میں آگ یا دھوپ سے بالجبر اور فطرت کے برخلاف گرمی پیدا کی۔ لہٰذا جب تک آگ یا دھوپ کا تعلق یا تسلط رہے گا، پانی اپنی فطرت کے برخلاف گرم رہے گا لیکن جب پانی پر سے آگ یا دھوپ کا تسلط ختم ہو گا تو پانی بغیر کسی بیرونی سبب کے خود بخود سرد ہو جائے گا۔ اسی طرح کمیونسٹ عوام کی فطرت ہے جس وقت اشتراکیت کا تسلط ختم ہو جائے گا تو فوراً اشتراکیت کی جگہ اختصاصیت آجائے گی جو انسانی فطرت ہے۔

۲۔ شخصی آزادی کے خلاف جنگ

انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اکتسابِ رزق اور مالکانہ اختیارات میں آزاد ہو۔ حیوانات کی طرح دوسروں کا آلۂ کار نہ ہو۔ لیکن اشتراکی نظام اسی فطری جذبے کو ختم کر دیتا ہے۔ ہم نے لینن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

> "اشتراکیت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اس سے پہلے جانوروں پر سوار ہوتا تھا۔ اب انسانوں پر سوار ہو گا۔"

تمام قومیں حقِ خود اختیاری کو تسلیم کرتی ہیں اور سیاسی آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں لیکن اگر سیاسی غلامی کے ساتھ شخصی غلامی بھی شامل ہو تو انسان کا شرفِ انسانیت ختم ہو جاتا ہے اور وہ ریاست کو کمانے کے لیے ایک جامد مشین بنتا ہے جس سے اس کا فطری حق اور انسانی اختیارات ختم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت

اسی فطری جذبۂ انسانیت کے خلاف جنگ ہے۔

۳۔ انسانی معاشرے کی تنظیم حاجتِ باہمی پر مبنی ہے، اشتراکیت اس کے خلاف جنگ ہے

انسانی معاشرے کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ میں باہمی ارتباط ہو۔ اس لیے فطرت نے انسان کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے تاکہ معاشرہ مستحکم اور مربوط ہو اور یہ حاجت فطرت نے دو طرفہ رکھی ہے۔ صاحبِ مال مزدور کے عمل کا محتاج ہے اور مزدور اجرتِ عمل کا محتاج ہے تاوقتیکہ یہ دو طرفہ حاجت قائم ہو تو افرادِ معاشرہ باہم دگر مربوط ہوں گے۔ لیکن اگر سب ریاست کے لیے کام کریں تو اربابِ ریاست سے تو ربط ہو گا لیکن آپس میں ارتباط ختم ہو جائے گا۔ قرآن میں لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۴۔ اشتراکیت انسانی اخلاقِ فاضلہ کے خلاف جنگ ہے

انسان کی بلندی اس کے اخلاق فاضلہ سے وابستہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر احسان کرے، ایثار کرے، ہمدردی کرے، رحمت و شفقت برتے۔ لیکن اگر سب یکساں طور پر صرف ریاست کے کارندے ہوں تو یہ فطری شریف اخلاق ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ غیر فطری مساوات میں ان اخلاق کے ظہور کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

۵- اشتراکیت انسان کی فطری تفاوت کے خلاف جنگ ہے

مال کمانے کے لیے فطرت نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں فکری قوت جس کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ مال کماتا ہے اور جسمانی قوت جس کے ذریعے مزدور کسان کماتے ہیں۔ فطرت نے انسان کی فکری قوت بھی یکساں نہیں رکھی۔ کوئی ایک وقت میں کمزوری کی وجہ سے کم کام کرتا ہے۔ کوئی قوت کی وجہ سے زیادہ۔ جب کمانے کے اسباب میں فطری تفاوت موجود ہے تو اس کے نتیجے میں یعنی مال میں بھی تفاوت ہو گا۔ کوئی کم مالدار کوئی زیادہ ہو گا۔ اس لیے اشتراکیت کی مصنوعی مساوات اس فطری تفاوت کے خلاف جنگ ہے۔

۶- اشتراکیت میلان الی اللہ کے خلاف جنگ ہے

انسان کی فطرت میں اگر جسمانی طور پر کھانے پینے کی طرف میلان موجود ہے تو روحانی طور پر اس کے اندر فطرۃً خدا کی محبت اور میلان بھی موجود ہے اور انسان کی پوری تاریخ اس فطری جذبہ محبت خداوندی کا مظہر ہے۔ لیکن اشتراکیت اس حقیقی خدا کی محبت کے خلاف جنگ ہے اور انسانوں پر چند کامریڈوں کی خدائی مسلط کرتا ہے۔

اشتراکیت کی بنیادی افکار پر تنقید

پہلا فکر

اشتراکیت کی شریعت میں کارل مارکس کو پیغمبر کی طرح تقدس حاصل ہے۔ اس لیے ہم مارکس فلسفہ کے افکار اس کی کتاب "سرمایہ" سے نقل کر کے اس پر تنقید کرتے ہیں تاکہ اس کی تضاد بیانی اور افکار کی ژولیدگی ناظرین پر واضح ہو جائے۔ ہیگل افلاطونی فلسفہ کی طرح افکار و تصورات کو اصل متوثر و عامل اور حقیقت سمجھتا ہے اور فطرت کائنات اور انسانی تاریخ اور واقعات کو اس کا تابع سمجھتا ہے۔ لیکن ہیگل کا متبع مارکس تصوریت کو خارجیت کا تابع سمجھتا ہے

تنقید

لیکن واقع میں دونوں نظریات کلی رنگ میں غلط اور جذباتی ہیں لیکن بعض جگہ تصوریت اصل اور خارجیت تابع ہے جیسے ایک انجینئر ایک چھاؤنی کا نقشہ ذہن میں تصور کرتا ہے اور یہ فرض کیا جائے کہ وہ نقشہ صرف اختراعی ہے اور اس کی نظیر پہلے سے موجود نہیں تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ اس تصور کے بعد جب وہ چھاؤنی تعمیر پاتی ہے تو یہاں تصوریت اصل ہے اور چھاؤنی کا خارجی وجود اس کا تابع ہے کہ اس تصور نقشے کے تحت وہ ظہور میں آیا۔ اس لیے مارکس کا ہر جگہ خارجیت کو اصل اور تصوریت کو تابع قرار دینا غلط ہے۔

لیکن بعض حالات میں خارجیت اصل ہوتی ہے اور تصوریت تابع۔ مثلاً ہم نے ایک بوٹی کو ایک مرض کے لیے بار بار استعمال کیا اور وہ اس مرض میں مفید ثابت ہو کر اس نے مرض کو دور کیا تو اس خارجی عمل سے ایک تصور، قانون تعلیل کا پیدا ہوا کہ فلاں بوٹی فلاں مرض کے ازالہ کی علت ہے۔ اسی طرح سائنس کے تمام مادی تجربات کا حال ہے کہ پہلے خارجی وجود میں اشیاء کا تجربہ کیا جاتا ہے، پھر ایک قانون کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً پانی سے بجلی اس طرح پیدا کی جاتی ہے، اور اسٹیم اس طرح پیدا ہو کر اس کے ذریعہ گاڑی چلائی جاتی ہے۔ یہاں پر خارجی تجربات پہلے کیے جاتے ہیں اور ان سے تصوری قانون تعلیل بعد میں پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام صورتوں میں خارجیت اصل ہے اور تصوریت تابع ہے لہٰذا مارکس کا یہ نظریہ غلط ہے کہ تمام صورتوں میں تصوریت تابع اور خارجیت اصل ہے۔

اس کے علاوہ ان دونوں مادی فلسفیوں کو یہ اقرار ہے کہ خارجیت اور تصوریت لازم ملزوم ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مادہ اور اس کی حرکت کو ازلی مانتے ہیں اور فطرت کائنات کو حرکت مادہ کا نتیجہ تسلیم کرتے ہیں اور یہ کہ نہ خدا کی ضرورت ہے اور نہ فطرت کائنات کے وجود کے لیے ارادہ کی حاجت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خارجیت کے ساتھ تصوریت ضروری ہے یا پہلے یا پیچھے تو مادہ اور اس کی حرکت کو جب عالم خارجیت کے لیے خدا کے مقام پر رکھا گیا تو وہ باتفاق فلاسفہ شعور اور علم اور تصور سے خالی ہے تو تصوریت کہاں سے آئے گی یہ تناقض اور

تضاد ہے۔

دوسرا فکر

مارکس کہتا ہے کہ:۔

"مذہب جن اسباب وعوامل سے پیدا ہوا وہ خوف و بیچارگی کا احساس ہے۔ اب فطرت خارجی پر ایک حد تک انسان نے قابو پالیا ہے، اس لیے خوف و دہشت باقی نہیں رہی تاکہ مذہب کا سہارا لینے کی ضرورت ہو۔"

تنقید

مارکس کا یہ فلسفہ بھی سو فی صدی غلط ہے کہ:

ا: "مذہب خوف سے پیدا ہوتا ہے۔"

اگر یہ درست ہے تو اشتراکی مذہب بھی معاشی خوف سے پیدا ہوا۔

ب: "فطرت خارجی پر قابو پانے سے خوف زائل ہوا۔"

۱۔۔۔ اگر زائل ہوا تو پھر اشتراکی مذہب کیوں پیدا ہوا؟ جب کہ فطرت پر قابو پالیا گیا ہے کیونکہ اشتراکیت بھی ایک مذہب ہے۔ جیسے ہم نے اسی کتاب میں ثابت کیا ہے۔

۲۔۔۔ کیا اس وقت جب کہ فطرت پر قابو پالیا گیا ہے خوف زائل ہو گیا یا اس میں لاکھ گنا ترقی ہوئی؟ خصوصاً ایٹم کی دریافت کے بعد۔ لہٰذا فطرت پر قابو پانے سے خوف کا دور ہونا بالکل غلط ہے۔

۳۔۔۔ اس کے علاوہ صحیح مذہب کی بنیاد خدا کی توحید پر ہے۔ اگر بفضل

مارکس اس دور میں توحید ماننے کی ضرورت نہیں کہ فطرت پر قابو پالیا گیا ہے اور اس نے خوف دور کیا تو اس دور میں خدا پر قابو پالیا گیا کہ اس سے خوف نہ کیا جائے یا یہ کہ اس دور میں اس کی قدرت کی وسعت اور زیادہ منکشف ہوئی کہ کائنات میں اس نے نہایت حکیمانہ قوانین وضوابط رکھے ہیں جن کی وجہ سے سائنس ظہور میں آئی کیونکہ سائنس دریافت کرنا قوانینِ قدرت کا نام ہے۔

۴۔ــــــ اور کیا چودہ سو سال قبل جب اسلام نے توحید باری تعالیٰ پھیلائی، اور بے شمار معبودانِ باطل کا خوف زائل کیا تو اس وقت فطرت پر قابو پالیا گیا تھا؟ اگر نہیں تو فطرت پر قابو پالینے کو ازالۂ خوف میں موثر سمجھنا غلط ثابت ہوا۔

۵ــــــ نیز مادہ اور اس کی حرکت کو ازلی سمجھنا جو مادہ پرستوں کا مذہب ہے یہ کس خوف کا نتیجہ ہے؟ شرکی مذاہب کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے غیر اللہ کے خوف سے شرک اختیار کیا لیکن جب اسلام نے کروڑوں انسانوں کے شرک کو مٹایا اور صرف اللہ کے خوف کو قائم رکھا تو انہوں نے ازالۂ خوف تبلیغِ اسلام سے کیا یا فطرت پر قابو پانے سے۔

تیسرا فکر

مسئلہ اضداد جس کو آج کی اصطلاح میں جدلیات بھی کہتے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ:۔

"ہر نظام زندگی، ہر تصور، ہر مادی شے اور معاشرتی حالت اپنے اندر ایک ضد کی پرورش کرتی ہے جو ایک خاص وقت پر ظاہر

ہو کر اس سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم سے ایک نیا نظام، نیا تصور، نئی مادی شے یا نئی معاشرتی حالت پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہر شے دو متضاد حقیقتوں یا متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک لکڑی سخت ہے کہ اس پر چیز رکھی جاسکتی ہے اور نرم بھی کہ اس میں میخ ٹھونکی جاسکتی ہے۔ یہ فلسفۂ اضداد ہیگل سے ماخوذ ہے"

تنقید

ان دونوں فلسفیوں نے اضداد کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ دو چیزوں میں فرق اور چیز ہے اور تضاد اور چیز ہے انجینیئرنگ اور ایگریکلچر میں فرق ہے لیکن تضاد نہیں۔ خود الحادی فلسفی نے بھی فلسفۂ اضداد کی تردید کی جس کا نام کروس ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ان دونوں نے دو چیزوں کے فرق کو تضاد سمجھا ہے جو غلط ہے مذہب اور آرٹ اور فلسفہ میں فرق ہے لیکن آپس میں ضد نہیں جن تصورات کو ایک دوسرے کا ضد قرار دیا جاتا ہے۔ وہ ایک اصل کے دو فروع ہیں اور ایک دوسرے کے مکمل ہیں"

دوسری بات کہ "ہر نظامِ زندگی اپنی ضد کی پرورش کرتا ہے جو ایک خاص وقت پر ظاہر ہو کر اس سے متصادم ہوتی ہے جس سے نیا نظام پیدا ہو جاتا ہے" اصولی طور پر اس میں **ایک غلطی** تو یہ ہے کہ اگر جدید نظام کی پیدائش اضداد کے تصادم کا ایک طبعی نتیجہ ہے تو اشتراکی نظام نے مسئلہ اضداد کے تحت خود بخود

پیدا ہونا تھا تو اس کے لیے کروڑوں انسانوں کی تباہی اور جد و جہد کی کیا ضرورت تھی؟ اس خاص وقت کا کیوں انتظار نہیں کیا گیا جس سے مسئلہ اضداد کے تحت پر اس طریقے سے نظامِ اشتراک پیدا ہوتا جب کہ مسئلہ اضداد کے اصول کے تحت وہ اس خاص وقت سے پہلے پیدا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایک بچہ شکمِ مادر سے مقررہ وقت پر پیدا ہوتا ہے تو اس میں ہنگامے برپا کرنے کی کیا ضرورت؟

دوسری غلطی یہ ہے کہ اگر مارکس کا نظریہ درست ہے تو ہر نظام کی طرح اشتراکی نظام بھی اپنی ضد کی پرورش کرتا ہوگا۔ پھر مستقبل میں ایک نیا مختلف نظام تصادمِ اضداد سے پیدا ہوگا جس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر نظام کی طرح تصادمِ اضداد کے قانون کے تحت اشتراکی نظام بھی کوئی مستقل نظام نہیں۔ اس کو ختم ہونا ہے۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ جب ہر نظام، ہر تصور اور ہر مادی چیز قانونِ اضداد کا قدرتی نتیجہ ہے تو انسانی سعی و عمل و جد و جہد محض بیکار اور لغو ہے۔

ان تین غلطیوں سے معلوم ہوا کہ مارکس اس نظریہ میں تضاد کا شکار ہو گیا ہے اور متضاد راہوں پر گامزن ہے۔

چوتھی غلطی یہ ہے کہ ان دو فلسفیوں کا یہ کہنا کہ ہر مادی شے اپنی ضد کی پرورش کرتی ہے، صاف غلط ہے۔ فلسفہ کے لحاظ سے مادی شے جوہر اور قائم بالذات ہوتی ہے اور جوہری اشیاء میں تضاد ناممکن ہے کیونکہ تضاد اوصاف اور عرضی اشیاء میں ہوتا ہے۔ مثلاً سیاہی سفیدی کی ضد ہے۔ وہ دونوں بیک وقت ایک

ہی چیز کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن جوہری اور مادی چیزیں کسی دوسری چیز سے قائم نہیں، بذاتِ خود قائم ہیں۔ ان میں تضاد نہیں۔

پانچویں غلطی یہ ہے کہ سختی و نرمی کی جو مثال دی گئی ہے کہ لکڑی میں دونوں جمع ہیں بالکل غلط ہے۔ اوّلاً اس وجہ سے کہ اگر وہ ضد ہوتی تو جمع دو ضدوں کا ایک محل میں ممکن نہیں، جیسے گرمی و سردی۔ دوم اس وجہ سے کہ لکڑی نہ لوہے کی طرح سخت ہے نہ پانی کی طرح نرم، بلکہ سخت چیزوں کی درمیانی قسم ہے۔ سخت چیز کی تین قسمیں ہیں:

اعلیٰ: جس میں میخ کو نہ ٹھونکا جا سکے، اگر ٹھونکی جائے تو ٹوٹ جاتی ہے اور آگ سے بھی نرم نہ ہو سکے، جیسے پتھر۔

دوم: وہ کہ میخ اس میں ٹھونکی جا سکتی ہے مگر تکلیف کے ساتھ اور وہ آگ سے نرم ہو سکے، جیسے لوہا۔

سوم: جو درمیانی قسم ہے کہ میخ اس میں آسانی کے ساتھ گھس سکے وہ لکڑی ہے۔ لہٰذا اس میں نرمی کا تصور غلط ہے بلکہ وہ سخت اشیاء کی ایک قسم ہے، یہ صاف تضاد بیانی ہے۔

چوتھا فکر

مارکس کہتا ہے کہ:

"مادہ ازلی ہے اور اس کا وجود ہی ہمارے ادراک و شعور پر موقوف نہیں اور کائنات کے جملہ مظاہر مادہ کی حرکت کے اثرات ہیں

تنقید

اس میں تضاد ہے کیونکہ اشتراکیت کا انکارِ خدا اس اصول پر مبنی ہے کہ وہ ہمارے شعور سے خارج ہے اور تجربات اور مشاہدات کے دائرے سے باہر ہے تو جب مادہ بھی ادراک و شعور کے دائرے سے باہر ہے تو اس کو کیونکر تسلیم کیا گیا ہے اگر کہا جائے کہ آثارِ مادہ سے ہم نے استدلال کیا تو کیا یہی استدلال آثارِ قدرتِ الٰہی سے خدا کے وجود پر نہیں ہو سکتا ؟

دوسری بات یہ ہے کہ کائناتِ عالم کو مادہ اور حرکتِ مادہ کی طرف منسوب کرنا اور خدا کی طرف منسوب نہ کرنا اس لیے نامعقول ہے کہ کائنات میں حیات بھی موجود ہے مثلاً انسان وغیرہ ہیں اور مادہ بالاتفاق حیات اور زندگی سے خالی ہے تو منفی سے مثبت اور غیر زندہ مادہ سے زندگی کس طرح وجود میں آئی جب کہ مثبت ہی سے مثبت پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کوئلہ اور لکڑی میں آگ موجود ہے تو اس سے آگ وجود میں آسکتی ہے لیکن راکھ اور خاکستر میں آگ موجود نہیں تو اس سے آگ وجود میں نہیں آسکتی۔ اس لیے مادہ کی طرف زندگی اور زندہ اشیاء کو منسوب کرنا خلافِ عقل ہے۔ معقول یہ ہے کہ زندہ ذات یعنی ربّ العالمین کی طرف عالم کو منسوب کیا جائے۔ جب تم نے مردہ چیز کو خدا کا مقام دینا ہے تو پھر زندہ خدا کو ماننے سے کیوں گریز کیا جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کائنات کا نظام پُرحکمت ہے اور وہ نہایت حکیمانہ قوانین پر مشتمل ہے جس کو وقتاً فوقتاً سائنسی تجربات سے ہم معلوم کرتے ہیں تو

کیا ایسا نظام خدائے علیم و حکیم کی طرف منسوب کرنا معقول ہے، یا اس مردہ اور بے جان مادہ کی طرف جو علم و حکمت اور شعور تک سے خالی اور محروم ہے ؟

چوتھی بات یہ ہے کہ عالم کے اندر ایک معقول ترتیب ہے۔ انسانی اعضا کے کل پرزے باہم دگر مرتب ہیں۔ اگر اس ترتیب میں ذرا برابر فرق پڑ جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح حیوان نباتات میں بھی ترتیب ہے۔ یہ ترتیب جو علم الحیوانات اور علم النباتات میں واضح کی گئی ہے اور ستاروں اور سیاروں میں بھی ترتیب ہے۔ یہ ترتیب علم و حکمت کے بغیر اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتی۔

فلاسفۂ جدید کا اتفاق ہے کہ اگر کاغذ کے مساوی سائز کے ٹکڑے کاٹے جائیں اور ایک پر ایک کا ہندسہ لکھا جائے اور دوسرے ٹکڑے پر ۲ دو کا، تیسرے پر تین ۳ کا، دس تک اور اس کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک اندھے آدمی کو دیا جائے یا کسی اَن پڑھ کو دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ تم اس میں سے ایک ایک ٹکڑہ نکالتے جاؤ تو اگر وہ کاغذ کے ان ٹکڑوں کے نکالنے کا عمل اربوں سال تک کرتا جائے تو باترتیب ایک سے دس پرزوں کے نکالنے کی نوبت نہیں آئے گی، تو عالم کائنات کی یہ عظیم ترتیب اندھے اور بے سمجھ مادہ سے اتفاقی طور پر کیونکر وجود میں آئی ؟ اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ؛

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ   کائنات اسی خدا کی کاریگری ہے۔

كُلَّ شَيْءٍ ———— جس نے مضبوط ترتیب ہر چیز میں قائم کر رکھی ہے۔ (پ۲۰۔ ع ۳)

۱۔ اسی وجہ سے ولٹار ک ریزک نیوٹن کہتا ہے کہ:۔

"موجودہ ترتیبِ عالم ایک ذاتِ علیم و قدیر کے بغیر ممکن نہیں۔"

۲۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ:۔

"یہ ضروری ہے کہ انسان کے اوپر ایک علم و حکمت والی ازلی ابدی قوت موجود ہے۔"

۳۔ فیل فلاریاں کہتا ہے کہ:۔

"تمام فلاسفہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر آیا اور کیونکر اس نے ترقی کی۔ لہذا وہ ذاتِ خالق کے اقرار پر مجبور ہیں۔"

۴۔ فونٹل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ:۔

"اللہ کی ہستی کا علم واضح اور بدیہی ہے۔"

پانچویں بات یہ ہے کہ مادہ اشیاء خود بخود کوئی خاص صورت اور شکل اختیار نہیں کر سکتا، جب تک ایک ماہر اور صاحبِ علم شخصیت اس میں تصرف نہ کر دے، سائنسی مصنوعاتِ جدیدہ مادے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کیا یہ شکلیں مادہ سے خود بخود وجود میں آئیں یا ماہرینِ فن کے فعل و عمل سے؟ اسی طرح کائنات کا عظیم مصنوع کے وجود میں آنے کے لیے بھی ایک ماہر ذات کی ضرورت ہے

اور وہ خدا ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ تجربات و مشاہدات میں خدا کا نہ پایا جانا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں۔ عدم علم اور چیز ہے اور علم عدم اور۔ خود مادہ جو تحقیق کی رو سے برق پاروں کا نام ہے اس کو اور اس کے خواص کو ہم نہیں جانتے۔ حیات اور زندگی اور روح کے باطنی صفات کو ہم مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں لا سکتے اور پھر بھی ہم ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔

ساتویں بات یہ ہے کہ مادہ کل کمالات میں خود انسان سے کم درجے کی چیز ہے اور انسان اشرف المخلوقات ہے تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کمتر چیز کو تخلیقِ کائنات منسوب ہو اور انسان اشرف کو منسوب نہ ہو؟

آٹھویں بات یہ ہے کہ انسان آخری ترقی یافتہ مخلوق ہے، اس کی ترقی اور ذہنی اور فکری ارتقاء کے لیے ایک ایسی ہستی کا وجود ضروری ہے جو اس کی ترقی اور بلند خیالی کے لیے نمونہ بن سکے۔ جیسے کم کمال رکھنے والا ہمیشہ اپنے سے بڑے باکمال ہستی کے نمونہ کو دیکھ کر اس کی نقل اتارنے اور اس سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی ذات خدا کا وجود ہو سکتا ہے، نہ مردہ بے جان اور بے سمجھ مادے کا۔

نویں بات یہ ہے کہ انسانی اصلاح اور درستی کے لیے ایسی ذات کا یقین ضروری ہے کہ اس کے کمال اور قدرت اور عدل، حکمت و جلال میں اس کی

کوئی نظیر نہ ہو تاکہ اس ذات کی دلوں کے باطن پر عظمت وحکومت برائی سے مانع اور بھلائی پر ابھارنے والی ہو۔

دسویں بات یہ ہے کہ دنیا میں ضعیف اور کمزور افراد کی تعداد زیادہ ہے، اور غالب اور قوی اور با اقتدار لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں۔ عالم اسباب میں ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے کوئی سہارا نہیں ہوتا جس سے ان کی یاس اور ناامیدی آس اور امید میں بدل جاتے اور ان کے دلوں کے لیے قوت اور اطمینان کا سامان ہو۔ یہ فطری ضرورت خدائے قادرِ مطلق اور علیم اور خبیر کی ذات پر یقین کرنے سے پوری ہوسکتی ہے، نہ مردہ اور عاجز مادہ کی تسلیم سے اسی لیے خدا کی ضرورت عقلی بھی ہے فلسفی بھی ہے اور فطری بھی ہے اور اصلاحی اور ارتقائی بھی۔

پانچواں فکر

ابدی صداقتوں اور وحی سے انکار

مارکس کہتا ہے کہ:

"کوئی صداقت ابدی نہیں بلکہ حالات کی تابع ہے۔ حالات جب بدل جاتے ہیں تو صداقت بھی بدل جاتی ہے، اس لئے کوئی صداقت ہمیشہ کے لیے صداقت نہیں احوال حرکتِ مادہ کے نتائج ہیں جو تغیر پذیر ہیں تو صداقت بھی تغیر پذیر ہے۔"

وحی کے متعلق کہتا ہے کہ:

"انسان کی اندرونی قوت کے سوا کوئی اور ذریعۂ علم نہیں، اس لیے وحی کا افسانہ غلط ہے۔"

تنقید اگر کوئی صداقت ابدی نہیں تو اشتراکیت کی صداقت اور مادہ اور مادہ کی حرکت کی صداقت بھی ابدی نہیں۔ جب احوال بدل جائیں گے تو یہ دونوں صداقتیں بھی ختم ہوں گی اور اگر یہ ختم نہ ہوں گی تو یہ تضاد اور تناقض ہے اور کیا ظلم کی برائی اور انصاف کی بھلائی ابدی نہیں اور اس طویل عرصے میں سب احوال کی تبدیلی سے وہ کیوں نہیں بدلے؟

درحقیقت ابدی صداقتوں کا انکار کوئی معقول نظریہ نہیں بلکہ یہ مادیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب مادہ پرستوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائناتِ فطرت اور انسانی تاریخ کے واقعات حرکتِ مادہ کے ناگزیر نتائج ہیں اور مادی مقاصد ہی سب کچھ ہے تو اس خیال سے خود بخود ضابطۂ اخلاق اور ابدی صداقتوں کا انکار لازم آتا ہے تاکہ مادی فوائد کے حصول کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

باقی وحی کا انکار تو اس لیے غلط ہے کہ وحی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں روحِ مطلق یعنی خالقِ کائنات کی طرف سے الفاظ اور مطالب کا القا ہو۔ خدا کے ثبوت میں دلائل پہلے بیان ہوگئے ہیں، اب اس کی طرف سے کسی منتخب ذات کے دل ودماغ میں کسی علم کا منتقل کردینا یہ وحی ہے جو بوجوہاتِ

ذیل درست ہے :-

۱۔۔۔۔ بہت سے حیوانات مثلاً چیونٹی، شہد کی مکھی، عنکبوت یا مکڑی کے متعلق جدید تحقیقات نے ایسے علوم بیان کیے ہیں جن کو معلوم کر کے انسان حیران ہو جاتا ہے۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اب ان علوم کا ان حیوانات کو حاصل ہونا کسی تعلیمی مروج طریقے سے ہوا؟ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ نہ وہ کسی اسکول میں داخل ہوتے، نہ کوئی کتاب پڑھی، نہ انہوں نے کسی استاد سے استفادہ کیا تو ظاہر ہے کہ ان کو یہ علوم غیر معروف طریقے یعنی الہام ربانی سے حاصل ہوتے :-

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ	اور تیرے رب نے الہام سے شہد
اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ	کی مکھی کو سمجھایا کہ تم پہاڑوں میں
بُیُوْتًا ــــــ	اس خاص طریقے سے شہد کا
(القرآن)	چھتہ بناؤ۔

جب حیوانات میں علم کا خارجی ذریعہ موجود ہے تو کیا انسانوں میں مخصوص حضرات انبیاء علیہم السلام کو خارجی قوت یعنی ذات رب العالمین بذریعہ وحی علوم منتقل نہیں کر سکتی؟

۲۔۔۔۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنوعات جدیدہ بھی الہام الٰہی کا نتیجہ ہے مثلاً سب سے پہلے جس موجد نے ہوائی جہاز کی مشین کو بنانا چاہا اور وہ مشین اب تک بنی نہیں تھی۔ اس لیے اس کے تجربات و مشاہدات سے اس کا صحیح نقشہ

خارج تھا۔ اس نے یقیناً اس نقشہ کی طرف اپنے ذہن کو متوجہ کیا ہوگا، لیکن موجد کا کام صرف طلب ہے اور فکر و ذہن کو متوجہ کرنا ہے ٹھیک نقشہ کا دفعتاً یا بعد از تجربہ ذہن میں آنا، یہ الہام ربانی سے ہوتا ہے۔ قرآن نے یہی بیان کیا:-

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ	مسلمان اور غیر مسلمان دونوں
هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ	جس چیز کو طلب کریں تو ہم ان
وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ ــــ	کو امداد دیتے ہیں اور تمہارے
مَحْظُوْرًا ــــــ	رب کی امداد کسی سے بند نہیں۔

یہ امداد وہ الہام الٰہی ہے جس سے اس چیز کا نقشہ اس کے دماغ میں ڈال دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

۳۔۔۔۔ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ انسان ایک بے جان آلہ میں ایک شخص کے الفاظ اور تقریر کو منتقل کر کے محفوظ کر سکتا ہے تو کیا خالق کائنات کے لیے یہ مشکل ہے کہ الفاظ وحی مثلاً قرآن کسی برگزیدہ رسول کے ذہن میں بے جان آلہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ایک جان دار ملکی قوت کے ذریعہ منتقل کر دے۔

حصّہ سوم

اسلامی اعتدالی نظام

اعتدالیت

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لیے اسلام نے اپنے معاشی نظام میں بھی فطرتِ انسانیہ کا لحاظ رکھا اور تمام فطری امور کو اپنی حالت پر رہنے دیا۔ البتہ جہاں کہیں ان میں کجی، زیغ اور بے اعتدالی واقع ہوئی تھی، اس کا ازالہ کر کے اس کو اعتدال پر لایا گیا۔ اسلام کے معاشی نظریہ کے خلاف اکتنازیت اور اشتراکیت کے معاشی نظریات میں چونکہ بے اعتدالیت اور فطرتِ انسانی کے حدود سے انحراف موجود تھا کیونکہ یہ دونوں نظریات جذباتی تھے اور جذباتی نظریات کے لیے فطرت کی حدود شکنی لازمی ہے۔ اس لیے اسلام نے اپنا معاشی نظام ایسا معتدل اور موافقِ فطرت رکھا کہ اس میں انسان کے تمام طبقات کا معاشی تحفظ اور حقوق کی رعایت بھی موجود رہی اور سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کی تمام خامیاں بھی اس میں دُور کی گئی ہیں۔

اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ان تمام دروازوں کو بند کیا جن سے عوام کی معاشی حالت متاثر ہوتی تھی اور جن سے سرمایہ دار غریب طبقے کا خون

چوستے تھے اور ان تمام امور کی بھی مخالفت کی گئی جن سے انسانی حریت اور شرافت اور خود مختارانہ جوشِ عمل پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ مال کے سکون کو اس نے حرکت میں تبدیل کیا اور غرباء میں امراء کے خلاف حسِّ عدوانی کو تیز کرنے کی بجائے حسِّ ایمانی اور اخلاقی کے ذریعہ دونوں میں محبت کا ربط قائم کر کے فقراء کے حقوق کو محفوظ کیا گیا اور بجائے غیر فطری مالی مساوات کے امراء اور غرباء میں اکتسابِ رزق میں قانونی مساوات کو قائم کیا اور قوانینِ عدلیہ میں امیر و غریب اور شاہ و گدا کو برابر رکھا اور ایسے امور میں جو انسانی جدوجہد کی پیداوار نہیں اور جن پر انسانی سعی و عمل اور محنت کے ذریعہ سے جائز طریقے سے بالذات یا بالواسطہ کسی انسان کا قبضہ نہ ہوا ہو۔ ان کو سب انسانوں کی مُشترک ملکیت قرار دیا۔

• یہ وہ دس اصول ہیں جن پر اسلام کے معتدل معاشی نظام کی عمارت قائم ہے۔

امورِ فطریہ انسانیہ کو اپنی حالت پر قائم رکھنا اور اشتراکی بے اعتدالی کی تردید

کمیونسٹ معاشی نظام میں غیر فطری مصنوعی مالی مساوات ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام میں غیر فطری تفاوت ہے۔ اسلام نے اعتدال قائم کیا اور دونوں کی تردید کی، مصنوعی مساوات کی تردید کی کہ وہ خلافِ فطرت ہے جب قدرت نے انسان میں دولت کی تخلیقی قوت میں فرق رکھا ہے۔ اس لیے سب انسانوں کی فکری اور دماغی قابلیت برابر نہیں اور نہ عملی قوت یکساں ہے تو انہی دو قوتوں کے فطری تفاوت کی

وجہ سے انسانی طبقات میں مالی تفاوت کا رونما ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اور دماغی قابلیت کے تفاوت کی وجہ سے تمام ملازم طبقوں کی تنخواہ یکساں نہیں اور نہ تمام تاجروں کی آمدنی برابر ہے اور نہ تمام اربابِ صنعت و حرفت کی کمائی برابر ہے کیونکہ فکر و عمل کی قوت برابر نہیں۔ اس لیے فطری تفاوت کے ثمرات و نتائج کو اپنی اصلی فطری حالت کے مطابق قائم رکھنا معقول ہے، اور اس فطری تفاوتِ مال کے خلاف جد وجہد درحقیقت فطرت کے خلاف جنگ ہے، جس کو کسی طرح معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے اسلام نے اس فطری تفاوت کو برقرار رکھا اور امراء و غرباء کے دونوں طبقوں کا وجود تسلیم کیا اور امراء کے طبقہ پر ایسی پابندی عائد کی کہ غریب طبقے کے حقوق بھی محفوظ رہیں اور امراء اپنے فطری حدود سے تجاوز نہ کرنے پائیں۔ یہ پہلی اعتدالیت ہے۔

سرمایہ دارانہ بے اعتدالی کی تردید اور امراء و غرباء دونوں کے حقوق کی حفاظت

امراء پر اسلام نے حسب ذیل پابندیاں لگائیں تاکہ اعتدال پیدا ہو کر غریب طبقے کے حقوق محفوظ ہو جائیں۔

۱ـــــ امیر طبقہ حدود فطرت و شریعت سے تجاوز کر کے سود کے ذریعہ مال میں اضافہ نہ کرے۔ بلکہ اس کے برخلاف غریب طبقہ کے قرض حسنہ کے طور پر امداد کرے۔

۲ـــــ رشوت ظلم اور دیگر ناجائز ذرائع سے مال نہ کمائے۔

۳ـــــ سرمایہ دار طبقہ وسائلِ رزق پر مثلاً تجارت، صنعت، کارخانہ سازی، زمینداری، ٹھیکہ داری اور ملازمت پر صرفِ دولت کے اثر سے اپنا قبضہ جما کر غیر سرمایہ دار طبقے کو محروم نہ کرے تاکہ ان وسائل سے غیر سرمایہ دار طبقہ بھی مستفید ہو سکے اور فطری تفاوت اپنے حدود میں رہے تاکہ وہ "قارونیت" کی شکل اختیار نہ کر سکے، ورنہ بجائے فطری تفاوت کے "قارونی تفاوت" رونما ہو گا اور تمام وہ مفاسد اور خرابیاں رونما ہوں گی جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصۂ لازمہ ہے۔

۴ـــــ امراء کے اموال میں فقراء طبقے کے جو حقوق ہیں، اسلام نے "قانونِ زکوٰۃ و عشر و خراج و دیگر صدقات" کے ذریعہ امراء کو فقراء کی حاجت روائی کے لیے جواب دہ قرار دیا تاکہ ہر سال امراء کے مال میں سے مناسب حصہ فقراء کو منتقل ہو کر "فطری تفاوت" اپنی حد کے اندر رہ کر بڑھنے نہ پائے۔

اسلام نے اپنے معاشی نظام میں اکتنازی اور اشتراکی معاشی نظاموں کی خامیوں کا ازالہ کیا

اکتنازی اور سرمایہ دارانہ نظام میں سب سے بڑی خرابی سودی کاروبار ہے۔ اسلام نے ہر قسم کے سود کو، مفرد ہو یا مرکب، حرام قرار دیا اور صرف اصل قرضے کی وصولی کی اجازت دی۔ ارشاد ہے:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ	اگر تم سود سے توبہ کرو گے تو
اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ	تم کو صرف اصل قرضہ ملے گا

وَلَا تُظْلَمُوْنَ (قرآن) نہ تم ظلم کرنے کے مجاز ہو کہ اصل قرضہ سے ایک کوڑی زائد لو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا کہ اصل قرضہ سے ایک کوڑی کم ملے۔

اسی طرح سورہ بقرہ پ۳ ع۶ میں ہے :۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا	اے ایماندارو! اللہ سے ڈرو
اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ	اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود
الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ	اگر تم کو اللہ کے فرمانے پر یقین ہے

اسی طرح

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ	حلال کیا خدا نے تجارت کو اور حرام
الرِّبٰوا (پ۳۔ ع۶)	کیا سود کو۔

ان تینوں آیات میں اللہ نے سرمایہ داری کی بنیادی نقص کو دور کیا اور سود کی تمام قسموں کو حرام ٹھہرایا۔ خواہ اضعافا مضاعفہ ہو یا کم، چاہے ایک چونی فی صد ہو۔ البتہ عرب میں ڈبل سود کا بھی رواج تھا جو سود کی بدترین شکل تھی کہ جب بھی میعاد پر قرضہ ادا نہ ہوتا تھا تو میعاد کے بڑھانے کے ساتھ ساتھ سود کی مقدار بھی بڑھاتے تھے، یہاں تک کہ سود کی رقم دوگنی سہ گنی ہو جاتی۔ اس کو بھی قرآن نے خصوصی طور پر حرام کیا۔ وَلَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً میں یہی شکل سود کی مراد ہے۔

الغرض کہ قرآن نے سود کے تمام اقسام کے دروازے بند کر دیے، اور

سودخوار کو ایسی شدید دھمکی دی گئی کہ قرآن میں کسی اور جرم پر ایسی دھمکی نہیں دی گئی۔ فرمایا :۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا	اگر سود نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ
بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اللہ اور رسول سے جنگ کرنے
(پ۳۔ ع۶)	کے لیے۔
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ	اگر سود سے توبہ کرو تو صرف
اَمْوَالِكُمْ (حوالہ مذکورہ)	قرض لینا ہوگا، نہ اس سے زیادہ

چاہے ایک پائی ہو۔

اس سے بعض مغرب زدہ لوگوں کی تحریفِ قرآنی کی حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن نے عمومی سود کو بھی حرام کیا اور ایک مخصوص صورت کو بھی جو قبیح ترین تھی اس کی حرمت کو بھی خصوصیت کے ساتھ ممنوع قرار دیا۔ ورنہ قرآن کے مضامین میں تعارض لازم آئے گا۔ فلکم رؤس اموالکم والی آیت صرف اصل قرضہ کی وصولی کے ساتھ جواز مخصوص کرتی ہے۔ اسی طرح ذروا ما بقی من الربوا والی آیت سود کا جو بھی باقی ماندہ مطالبہ ہو اس کو حرام قرار دیتی ہے۔ اب اگر حرمت صرف ڈبل سود سے مختص ہو تو ان دونوں آیتوں کے خلاف ہوگا اور اگر سب صورتیں حرام ہوں تو سب آیتوں پر عمل ہوگا۔ اور کوئی آیت متروک العمل نہ رہے گی۔ یہی معنی تقریباً چودہ سو سال سے ماہرین قرآن نے

سمجھے۔

قرآن کا تواتر لفظی و معنوی

قرآن میں لفظی اور معنوی تواتر دونوں ہیں جس طرح الفاظِ قرآن تواتر سے ثابت ہیں اور ان کو زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے بدلا نہیں جا سکتا تو قرآن کے واضح مطالب بھی متواتر ہیں۔ کسی زمانے میں بھی ان متواتر معانی و مطالب میں تبدیلی و تحریف کی گنجائش نہیں، خواہ ربٰو یا سود ہو یا صوم و صلوٰۃ یا حج و زکوٰۃ یا دیگر مطالبِ متواترہ۔

اگر بالفرض مطالبِ قرآنیہ متواترہ محفوظ نہ رہے اور ہر کس و ناکس جب چاہے اس کو تبدیل کر سکتا ہے تو پھر الفاظِ قرآن کی محفوظیت بھی بے فائدہ ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ حفاظتِ الفاظ کی غرض حفاظتِ مطالب و معانی ہے۔ اگر معانی محفوظ نہیں تو صرف لفظ کی حفاظت سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

حرمت متجزی نہیں

حرمتِ اشیاء میں اسلامی ضابطہ یہ ہے کہ اس میں قلیل و کثیر کے لحاظ سے تفاوت نہیں ہوتا کہ کثیر سود حرام ہو اور قلیل جائز ہو۔ چوری کثیر و قلیل دونوں حرام ہیں۔ ڈاکے کے ذریعہ قلیل و کثیر مال حاصل کرنا دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ مردار کھانا قلیل و کثیر دونوں ناجائز ہے۔ لہذا سود میں یہ حد بندی کہ سود مفرد حلال ہو اور سود مرکب حرام ہو، عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

الغرض جو چیز مدارِ حکم ہو۔ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔ اس سے حکم کی تبدیلی نہیں

ہوتی۔ مثلاً چوری حرام ہے اور حرمت کا مدار اس کا چوری ہونا ہے۔ اب چوری تھوڑی ہو یا زیادہ دونوں صورتوں میں حرام ہے اس میں کم و بیش، قلیل و کثیر کا حکم ایک ہی ہوگا کہ سب صورتیں حرام ہوں گی۔ اسی طرح مردار حرام ہے، خنزیر کا گوشت، نشہ آور چیز حرام ہے، ڈاکہ حرام ہے، غصب اور ظلم حرام ہے۔ ان سب میں کم و بیش، قلیل و کثیر کا ایک ہی حکم ہوگا اور سب صورتیں حرام ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کسی چیز پر فساد کی وجہ سے حرمت کا حکم لگاتی ہے اور فساد خواہ قلیل ہو یا کثیر دونوں واجب الاجتناب ہیں۔

دین میں اس قسم کا تجدد، تجدد و اصلاح نہیں، تجدد و فساد ہے اور تقلیدِ فرنگ کا بہانہ ہے۔ بقولِ اقبال رحمہ

محسوس یہ ہوتا ہے کہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

مسلم اور حربی، عبد اور مولیٰ میں جوازِ ربٰو نہیں بلکہ عدمِ وجودِ ربٰو ہے

بعض مغرب زدہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ "فقہ میں مسلمان اور حربی، مولیٰ اور غلام کے درمیان ربٰو کی صورت کو جائز قرار دیا گیا ہے"

یہ غلط ہے۔ ان دونوں صورتوں میں فقہ نے جوازِ ربٰو کا فتویٰ نہیں دیا، بلکہ ربٰو کے وجود سے انکار کیا۔ یعنی ان دونوں صورتوں میں ربٰو شرعی متحقق نہیں۔ نہ یہ کہ ربٰو شرعی متحقق ہے لیکن جائز ہے اور ان دونوں صورتوں میں آسمان و زمین

کا فرق ہے۔

ربوٰ کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ بلا عوض مقابل کسی دوسرے شخص کا معصوم مال حاصل کیا جائے۔ عبد اور مولیٰ میں اگر کوئی ایسا تبادلہ ہو جائے کہ مولیٰ نے غلام کے ہاتھ سے دو روپے ایک روپیہ کے عوض میں لیے تو چونکہ عبد اور غلام کے وہ دو روپے درحقیقت خود مولیٰ کے ہیں۔ اس لیے دو مالکوں میں تبادلہ نہیں ہوا بلکہ یہ ایسا ہوا کہ ایک مالک نے کسی شخص یعنی غلام کے پاس ایک روپیہ بطورِ امانت رکھا اور دو روپے اپنے جو اس کے پاس تھے، وہ واپس لے لیے۔

اسی طرح حربی کا مال مباح ہے، شکار اور صید کی طرح اس کی ملکیت نہیں۔ مالکِ حقیقی نے اس کی ملکیت کو ختم کیا ہے۔ اب صرف قبضہ ہی فیصلہ کن ہے جب حربی کے مال پر قبضہ کیا گیا تو یہ ایسا ہے۔ جیسے شکار پر قبضہ کیا جائے۔ یہ بھی دو مالکوں میں تبادلہ نہیں۔ یہی راز ہے کہ فقہاء نے ان دونوں صورتوں میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا کہ یجوز الربٰوا بین المسلم و الحربی و بین العبد و مولاہ بلکہ یوں تعبیر کی کہ لا ربٰوا بین المسلم و الحربی ثم لا بین العبد و مولاہ یعنی دونوں صورتیں سرے سے ربوٰ نہیں اور نہ ہی ربوٰ کا شرعی مفہوم ان میں موجود ہے۔

اسلام نے اکتنازیت اور احتکاریت اور وسائلِ رزق پر ایک طبقہ کا قبضہ ختم کیا اور اشتراکیت کے خلاف شخصی حرّیت کو برقرار رکھا

۱۔ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ

جو مال کا خزانہ جمع کرتے ہیں اور فقراء پر خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔ (قرآن)

۲۔ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ

جو لوگ مال جمع کرتے ہیں اور گن گن کر اس کو رکھتے ہیں۔ ان کو دوزخ میں ڈالا جائیگا۔ (قرآن)

۳۔ صحیح مسلم میں معمر مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں:-

من احتکر فھو خاطی (حدیث)

جو انسانی خوراک کو گرانی کی نیت سے ذخیرہ کرے وہ مجرم ہے۔

۴۔ قرآن نے یہ ارشاد فرما کر ایک طبقہ کا انسانی ذرائع معایش پر قبضہ کرنے کو رد کیا۔

۵۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ
(قرآن)

یعنی زمین کے تمام ذرائعِ معاش سے استفادہ کرنا تمام انسانوں کا حق ہے۔

ہر انسان اپنی فطری قوتِ فکر و عمل سے اکتسابِ رزقِ حلال اور اضافۂ ملکیتِ شخصی میں حدودِ شریعت کے اندر رہ کر آزاد ہے اور مالداری کا فطری تفاوت عینِ فطرت و حکمت ہے۔

۶۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا
بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا
سُخْرِيًّا

ہم نے فطرۃً اکتسابِ معیشت کی قوتیں انسانوں میں تقسیم کی ہیں۔ اور ان میں اونچ نیچ رکھا ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔

بیضاویؒ لکھتے ہیں کہ:

"ایک دوسرے کو اپنے کاموں کے لیے استعمال کر سکیں اور ان میں الفت اور نظم قائم ہو تاکہ نظامِ عالم درست رہ سکے۔"

حکمتِ تفاوتِ مالی

جس حکمت کی طرف قرآن نے اجمالی اشارہ کیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ نظمِ بشری اور جماعتِ بشریہ کی تالیف ایک اہم نصب العین ہے۔ انسانی فطرت دیگر حیوانات

کے برخلاف اجتماعیت کا متقضی ہے۔ ہر حیوان بجز انسان کے الگ تھلگ رہ سکتا ہے لیکن انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے اجتماعیت کے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی انفرادی صورت میں زندگی نہیں گذار سکتا۔

حاجتِ لباس

انسان کو کپڑے کی ضرورت تھی تاکہ دفعِ حر و قر یعنی گرمی اور سردی سے بدن کی حفاظت کر سکے۔ کپڑا سوت سے بنتا ہے لہذا اس کو ایک مزارع کے تعاون کی ضرورت ہے کہ وہ کپاس کاشت کرے۔ پھر اس کو کپاس میں سے روئی اور بنولے کو ایک دوسرے سے جدا کر دینے کے لیے ایک اور معاون کی ضرورت ہے۔ روئی کو کات کر دھاگہ بنانے کے لیے کاتنے والے کا محتاج ہے۔ دھاگہ حاصل ہونے کے بعد اس کو جلاہے کی ضرورت ہے کہ کپڑا تیار کر دے۔ سینے کے لیے اس کو درزی اور رنگانے کے لیے رنگ ساز کی ضرورت ہے۔ اس پوری جماعت کے تعاون کے بعد وہ کپڑے سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر اونی اور تسری کپڑا ہو یا عورتوں کے لیے ریشمی کپڑا تو ان سب میں ایک انسان کو دیگر متعدد انسانوں کی اعانت کی ضرورت ہے کیونکہ ایک انسان خود تنہا یہ سب کام انجام نہیں دے سکتا۔

مسکن کی حاجت

اسی طرح انسان کو مکان کی بھی ضرورت ہے جس میں اینٹ، چونا، پتھر اور سیمنٹ حاصل کرنے کے لیے

اس کو دوسرے انسانوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ لکڑی کے کام کے لیے بڑھئی اور نجار اور لوہے کے کام کے لیے لوہار، تعمیر کے لیے معمار اور مزدور کی ضرورت ہے، جب کہیں جا کر مکان تیار ہو گا۔

علی ہذا القیاس خوراک کی فراہمی کے لیے غلہ کاشت کرنے والا، پیسنے والا، توا یا تنور بنانے والا، ہنڈیا تیار کرنے والا۔ گھی اور مصالحہ فراہم کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جگہ صاف کرنے کے لیے بھنگی، حجامت درست کرنے کے لیے حجام، کپڑے دھونے کے لیے دھوبی کی ضرورت ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری زندگی کا نقشہ انفرادی نہیں، اجتماعی ہے اور انسان کا یہ اجتماعی نظامِ حیات حاجت پر مبنی ہے۔

اسی حاجت کی وجہ سے افرادِ انسانی میں ربط، جوڑ اور نظم قائم ہے۔ اگر سب انسان مالداری میں برابر ہوں تو ایک انسان دوسرے سے کس طرح کام لے سکے گا۔ مثلاً اگر مساوی انسانوں میں سے ایک دوسرے سے کہے کہ میری حجامت بناؤ تو وہ کہہ سکتا ہے کہ تم میری حجامت بناؤ۔ میں تم سے کس بات میں کم ہوں؟ یا یہ کہے کہ میرے کپڑے دھو ڈالو تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ تم میرے کپڑے دھو لو کیونکہ ہم دونوں برابر ہیں۔ قلی سے کہا جائے کہ یہ صندوق اٹھاؤ تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کیوں اٹھاؤں، مجھے اٹھانے کی حاجت نہیں تم خود اٹھاؤ۔

بہرحال کام لینے کے لیے تفاوت کا وجود ضروری ہے کہ کام لینے والا کام کا محتاج ہو اور کام کرنے والا اجرت اور پیسے کا محتاج ہو۔ لہذا عمل اور مال میں تبادلہ ممکن ہو سکے گا اور اگر مال یکساں ہو تو یہ تبادلہ ممکن نہیں۔ ہر انسان کو اپنا کام اور عمل خود کرنا پڑے گا اور انسانوں کی ربطِ باہمی کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ مدار ربطِ حاجت ہے۔ یہ قدرت کا عجیب انصاف ہے کہ ربط قائم کرنے کے لیے مالی تفاوت کی ضرورت تھی تاکہ بے مال یا کم مال والا، مالدار کے لیے کام اور عمل کر کے مال کما سکے، لیکن اگر حاجت صرف عامل کی طرف سے ہوتی تو مالدار فرعون بے سامان بن جاتا لہذا قدرت نے دو طرفہ حاجت کا نظام قائم کیا ہے۔ عامل اور مزدور کو اجرت، تنخواہ اور مال کی حاجت ہے تو مال دار کو قدرت نے عمل کا محتاج بنایا تاکہ دو طرفہ حاجت کی وجہ سے ہر ایک دوسرے کا محتاج رہے اور کسی میں شانِ استغناء اور بے نیازی پیدا نہ ہو، تاکہ کوئی ایک دوسرے پر زیادتی نہ کر سکے۔

جوشِ عمل کے لیے حریّت کی ضرورت

اسلام نے شخصی ملکیت کو برقرار رکھ کر اضافہ ملکیت کی تحریک کی وجہ سے اس نے مالکان کے تعطل کو دور کر کے ان میں جوش عمل پیدا کیا اور ان کو حیوانیت سے اٹھا کر مقامِ شرفِ انسانیت پر پہنچایا کہ وہ نظامِ اشتراکی کی طرح حکومت کے لیے مشین بن کر کام نہ کرے بلکہ ایک مالک با اختیار کی طرح سعی و عمل میں مصروف رہے

اشتراکی معاشی نظام میں انسان دیگر انسانوں پر خدائی قائم کرتا ہے اور اس کی تمام قوتوں کو خود مختارانہ نہیں بلکہ اپنے منشاء کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ جس سے وہ انسان نہیں رہتا، بلکہ حکومت کی ایک مشین بن جاتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا:۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا	کہ انسان اپنی کوشش اور جدوجہد
مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ	سے آزاد استفادہ کرنے کا مالک
يُرٰى ــــــــــــ	ہے اور جو کچھ اپنی سعی سے کمائے

گا اس کو وہ دیکھ پائے گا۔

وَهَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا	انسان کو اپنے ہی عمل کا بدلہ ملے
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	گا ــــــــــــ

یہ قانون انسان کے دنیوی واخروی دونوں قسم کے اعمال پر حاوی ہے۔ اشتراکی انسان سے جانور کی طرح کام لے کر گھاس چارہ کھلاتا ہے جو انسان کو حیوان بنانے کے مترادف ہے۔

حرکتِ دولت

سرمایہ دارانہ نظام کی اس خامی اور کجی کو کہ اس میں دولت ایک خاص طبقہ میں ساکن ہو کر رہ جاتی ہے اور دوسرے لوگوں تک حرکت نہیں کرتی جس سے، دوسرے لوگوں میں غربت اور افلاس رونما ہو جاتا ہے اور انسان کے اجتماعی جسم کا ایک بڑا حصہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

بعینہٖ اس طرح ہے کہ اگر ایک شخص کے بدن کا خون چند اعضا بدن میں یا ایک عضو میں بند ہو کر رہ جائے اور دوسرے اعضاء کی طرف گردش نہ کرے، تو وہ اعضا یقیناً مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔ ایک شخص کے لیے خون اور جماعت کے لیے دولت یکساں طور پر موادِ حیات ہے۔ قرآن نے پہلے اس بنیادی اصول کا اعلان کیا:۔

لِكَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ	کہ تقسیم سب میں اس لیے ضروری
الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ط	ہے کہ مال صرف اغنیاء کے

طبقے میں گردش نہ کرنے پائے۔

یہ تو اس بنیادی اصول کا اعلان تھا۔ لیکن اسلام نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلام نے اصلاحِ معاش کے لیے ایسے قوانین نافذ کیے، جن سے حرکتِ دولت پر عمل ہو۔

۱۔ حرکتِ حیاتِ معادن باطنہ وظاہرہ

اندرونِ زمین میں جس قدر دولت ہے خواہ سونا چاندی ہو یا لوہا۔ ان میں فقہ اسلامی کے تحت ۱/۵ یعنی خمس فقراء کو دلوایا تاکہ گردشِ دولت کی تکمیل ہو۔

(فتح القدیر باب الخمس)

یہ تو معدنیاتِ باطنہ کا حال ہے جو محنت و مشقت کے ذریعہ نکالے جاتے ہیں۔ باقی معدنیاتِ ظاہرہ وہ مجموعی حیثیت سے تمام عوام کا حق ہے۔ کسی شخص

کے ساتھ یا کسی طبقے کے ساتھ مختص نہیں۔ (مغنی ابن قدامہ ج ۶ ص۱۵۶)

۲۔ قانونِ عشر ۱/۱۰ زمین کی ایسی پیداوار جس کی آبپاشی میں تکلیف نہ ہو۔ اس میں فقراء کے لیے دسواں حصہ ہے:۔

ماسقته السماء او كان عثريا ففيه العشر (صحیحین عن ابن عمرؓ)	جو زمین بارش سے سیراب ہو یا دریا کی نمی سے نشوونما پائے۔ اس کی پیداوار میں فقراء کا حق دسواں حصہ ہے۔

۳۔ نصف عشر ۱/۲۰ جو زمین رہٹ، ڈول، ٹیوب ویل سے سیراب ہو۔ اس کی پیداوار میں فقراء کا بیسواں حصہ ہے۔

۴۔ ربع العشر ۱/۴۰ نقد اور اموالِ تجارت اور تمام کاروباری آمدنی میں نصاب اور ایک سال گذرنے کی شرط پر فقراء کے لیے چالیسواں حصہ یعنی ڈھائی فیصد کا حق ثابت ہے۔ تقریباً اسی کے لگ بھگ ان مواشیوں میں بھی فقراء کے لیے زکوٰۃ کا حصہ مقرر ہے۔ جس کی تفصیل فقہ میں ہے۔ مثلاً پانچ اونٹوں میں ایک بکری یا اس کی قیمت۔ چالیس بکریوں یا دنبوں میں جو چر کر پلتے ہوں، ایک بکری یا ایک دنبہ یا اس کی قیمت۔ گائے، بیل اور بھینس اگر تیس ہوں تو یک سالہ بچہ، چالیس ہوں تو دو سالہ بچہ۔

قانونِ استحبابی، فقراء نوازی، حسّ اخلاقی کے ذریعہ نہ حسّ عدوانی کے ذریعہ

اگر ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ عوام غربت اور افلاس کا شکار ہوں تو امراء کے پاس اپنی ضرورت سے جس قدر مال زائد موجود ہو وہ قانونِ استحبابی کے تحت سب فقراء میں تقسیم ہو:۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط	آپ سے اے پیغمبر! پوچھتے ہیں۔ فقراء پر کیا خرچ کریں؟

آپ کہہ دیں کہ تمام وہ مال خرچ کر دو جو ضرورت سے زائد ہو۔

ابنِ حزم ضرورت کیوقت اغنیاء کے اموال کو فقراء پر برابر تقسیم کرنا لازمی قرار دیتے ہیں اور اس پر اجماعِ صحابہ نقل کرتے ہیں

ابن حزمؒ المحلی میں لکھتے ہیں کہ:۔ "علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ نے اغنیاء پر ضروریات فقراء پر فرض قرار دیا ہے۔ اگر فقراء بھوکے اور ننگے ہوں اور اغنیاء کے نہ دینے کی وجہ سے تکلیف میں پڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سے حساب لے گا اور سزا دے گا۔ ضرورت کے وقت اغنیاء سے مال لے کر سب پر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

ابو عبیدہ بن الجراح اور تین سو صحابہؓ نے توشہ جمع کر کے سب پر برابر تقسیم

کیا۔ جن کو دو توشہ دانوں میں جمع کر کے برابر بقدر قوت سب کو دیتے رہے۔ عربی عبارت یہ ہے:۔

"عن علی ان اللہ فرض علی الاغنیاء فی اموالھم بقدر ما یکفی الفقراء فان جاعوا او عروا وجھدوا بمنع الاغنیاء نحق علی اللہ ان یحاسبھم یوم القیامۃ و یعذبھم و عند الحاجۃ یقسم المال علی السواء صح عن ابی عبیدۃ بن الجراح و ثلاثمائۃ من الصحابۃ ان زادھم نفی فجمعوا ازوادھم فی مزودین وجعل بقوتھم علی السواء فھذا اجماع مقطوع بہ من الصحابۃ" (المعلی ج ۶ ص ۱۵۸)

پھر اسی طرح ابوسعید کی مرفوع حدیث اور حضرت عمر سے بھی نقل کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:۔

عن ابی سعید مرفوعا من کان معہ فضل ظھر فلیعد بہ من لا ظھر لہ ومن کان معہ فضل زاد فلیعد بہ من لا زاد لہ قال فذکر اصنافا من المال حتی راینا انہ لا حق لنا فی الفضل۔ فضول اموال الاغنیاء فقسمھا علی فقراء المھاجرین وھذا فی غایۃ الصحۃ

والجلالۃ (معلی ج ۶ ص ۱۵۸)

ابوعبیدہ کے ہمراہ تین سو صحابہ تھے۔ جن میں اکثر کے پاس توشہ یعنی زادِ راہ ختم ہو چکا تھا۔ آپ نے جن کے پاس زادِ راہ تھا۔ ان سے لے کر سب پر برابر تقسیم کیا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کے فعل پر اعتراض نہیں کیا۔ ابوعبیدہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور لسانِ رسالت سے آپ کو "امینِ امت" کا خطاب ملا ہے۔

مذکورہ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

ابوسعید حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو وہ اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں اور جس کے پاس زادِ راہ زائد موجود ہو۔ وہ اس کو دیدے جس کے پاس زادِ راہ نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسی کئی ضرورت کی چیزیں ذکر فرمائیں یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ ہمارے پاس ضرورت سے جو چیز زائد موجود ہو۔ اس میں ہمارا کوئی حق نہیں۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے (معلی ج ۶ ص ۱۸۵)

حضرت عمر سے ابن حزم نے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے جن حالات کا بعد میں علم ہوا۔ اگر مجھے اس کا پہلے علم ہوتا تو میں دولت مندوں سے ضرورت سے زائد اموال لے کر فقراء مہاجرین پر تقسیم کرتا۔ اس روایت کی

سند نہایت صحیح اور جلیل الشان ہے۔

قل العفو والی آیت اور ان روایات پر نظر ڈال کر کیا اس امر کا یقین حاصل نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے معاشی نظام میں عوام کی حالت اشتراکی نظام کی نسبت زیادہ بہتر اور زیادہ پُر محبت و خلوص ہوگی اور وہ تمام نقائص بھی نہ ہوں گے جو اشتراکی نظام میں موجود ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے تھے کہ :۔

"جب میں نے صرف اس ایک آیت یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط کا ترجمہ شاہ امان کو سنایا تو جوش میں آ کر اس نے کہا کہ اگر ہم پہلے اس سے واقف ہوتے تو ہمیں کمیونزم کی ضرورت نہ ہوتی۔"

بہر حال ابن حزم نے جو کچھ لکھا وہ ان کے نزدیک یہ ایک جبری قانون ہے لیکن اگر اس کو باہمی رضامندی اور جذبۂ اخوت کے تحت رضاکارانہ طور پر عمل میں لایا جائے تو یہ معاشی خوشحالی کے لیے بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔

قانونی مساوات اور شاہ و گدا کی برابری

امراء عوام کے حقوق کو اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ غصب کرتے ہیں اور پھر عوام کی حق رسی نہیں ہوتی۔ لہذا حکومت کا ہونا نہ ہونا عوام کے لیے برابر ہو جاتا ہے۔ اسلام نے قانونی حقوق میں مساوات قائم کرکے اس خامی کو دور

کیا، اور شاہ و گدا کو قانونِ انصاف کے آگے برابر کر دیا۔

زبانی دعویٰ تو ہر حکومت ہی کرتی ہے، لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے اسلامی تاریخ کے علاوہ کسی دین و آئین میں مساواتِ قانونی کا عملی رنگ موجود نہیں۔ خلفاء اور شاہانِ اسلام کو ایک معمولی غریب کے دعوے کی جواب دہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا اور عدالت کا فیصلہ سنتے ہی اس پر عمل کرتے تھے۔ اسلامی تاریخ مساواتِ قانونی کے عملی واقعات سے لبریز ہے۔ ہم اختصاراً ان کو ترک کرتے ہیں لیکن اس کے برخلاف انگلستان کے آئین میں صاف لکھا ہے کہ

"بادشاہ ہر قانون سے مستثنیٰ ہے۔"

اسلامی معاشی نظام میں اشیاء مشترکہ

اسلام کے معاشی نظام میں اشیاءِ مشترکہ یا بالفاظِ دیگر اسلامی اشتراکیت — اسلام دینِ فطرت ہے۔ لہذا اس نے اپنے معاشی نظام میں ایسی اشیاء کو شخصی ملکیت سے مستثنیٰ کر کے مشترک عوامی ملکیت میں شامل کیا جن کا تعلق انسانی جد و جہد اور انسانی سعی و عمل سے نہیں اور جن کی ضرورت سب عوام کو ہے۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :۔

"علویات میں سے آفتاب و ماہتاب اور سفلیات میں سے پانی (دریا کا ہو یا سمندر کا)، آگ، گھاس، نمک خشکی یا آبی شکار، مشترک ہیں۔" (ابن ماجہ، ہدایہ، کتاب الخراج امام ابو یوسف)

ان مذکورہ اشیاء کے ساتھ سب عوام کا حق متعلق ہے۔ کوئی کسی کو محروم نہیں کر سکتا اور نہ حکومت عوام پر پابندی لگا سکتی ہے۔ الّا اس صورت میں کہ عوام کو اس میں نقصان ہو۔ دریا میں سے ہر آدمی کو پانی پینے کا حق ہے، جانوروں کو پانی پلانے کا بھی حق ہے۔ نالی کھود کر کھیت سیراب کرنے کا بھی حق ہے۔ اس میں کشتی چلا کر پیسے کمانے کا بھی حق ہے۔ اس کے پانی میں مچھلی پکڑنے کا بھی حق ہے، خواہ دریا ہو یا سمندر۔ اسی طرح خودرو گھاس میں ہر آدمی کا حق ہے خواہ خود کاٹے یا اگر مالک زمین کو ضرر ہو تو وہ خود کاٹ کر اس کے حوالہ کر دے۔ اسی طرح پہاڑوں سے قدرتی نمک حاصل کرنا ہر آدمی کا حق ہے کہ اس سے استفادہ کرے۔ زمینی، سمندری اور دریائی شکار پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ تمام عوام اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سمندر سے جو جواہرات، عنبر وغیرہ نکلتے ہیں۔ وہ سب کا حق ہے۔

وفی الغایة شرح هدایه فیما فی البحر لا یملک الامام ان یخص واحدا دون واحد

غایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ بادشاہ کا حق نہیں کہ سمندری اشیاء کو کسی کے لیے مختص کر دے۔

مرافق بلد

جو غیر مملوکہ زمین شہر سے باہر ہو لیکن شہر والوں کو اس کے جنگل میں سے لکڑی جلانے کی ضرورت ہو یا مویشی چرانے کی ایسی

زمین مشترک رہے گی تاکہ شہری ضرورت اس سے پوری ہو سکے۔ وہ موات کے حکم میں نہیں کہ کوئی ایک فرد اس پر قبضہ کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ حکومت وہ کسی کو بطور جاگیر دے۔

وما کان خارج البلد من مرافقها ومحتطبا لاهلها ومرعا لهم لا یکون مواتا فلا یملک الامام اقطاعها (عنایه علی الهدایه ج ۴ ص ۳۵۰)

فناء عامہ مشترک ملکیت ہے

آبادی کے قریب کھلی زمین عوام کی ملکیت ہے جس میں وہ مویشی چرائیں گے اور کٹی ہوئی فصل رکھیں گے۔ تو ان منافع عامہ کے تعلق کی وجہ سے وہ زمین موات کے حکم میں نہیں وہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بن سکتی۔

وفی الزیلعی علی الهدایة ج ۶ ص ۳۸ وفناء العامة ینتفعون به لانهم محتاجون الیه لمرعی مواشیهم وحصائدهم فلم یکن انتفاعهم منقطعا منه ظاهرا فلا یکون مواتا۔

معادن ظاہرہ عوام کی ملکیت ہے

المعادن الظاهرة وهی التی یوصل الیها بغیر مونة ینتابها الناس وینتفعون بها کالملح والماء والکبریت والقیر والمومیا والنفت والکحل والیاقوت ومقاطع الطین واشباه ذلک۔ ذلك

لا تملك بالاحیاء ولا یجوز اقطاعها لاحد من الناس (المغنی لابن القدامہ ج ۶ ص ۱۵۶)

ترجمہ :- کھلے معدنیات جن تک رسائی میں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اس کو عوام باری باری سے استعمال میں لائیں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے، جیسے نمک، پانی (جس میں سوئی گیس بھی داخل ہے) گوگرد، تارکول، مومیائی، مٹی کا تیل، پٹرول، سرمہ، یاقوت اور خاکی ٹکڑے (جس میں کھاد بھی داخل ہے)

خراج اور مالگذاری میں عوام کا حق

الخراج فیئ بجمیع المسلمین ان عتب علی ارض الخراج و انقطع الماء او اصطلم الزرع فلا خراج (کتاب الخراج لابی یوسف)

ترجمہ :- خراج تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ اگر زمین پہ آفت پڑے یا پانی نہ ہو یا فصل برباد ہو جائے تو خراج وصول نہیں کیا جائے گا۔

ادائے کفایت

مزارع مسلم و غیر مسلم کو تخم بیل وغیرہ کی رقم دی جاتی تھی۔ ان یدفع للعاجز کفایۃ من بیت المال (فتح القدیر ص ۱۵۵)

غیر مسلم رعیّت بھی اگر محتاج ہو تو وہ بیت المال سے روزینہ کی مستحق ہے

معاہدۂ حیرہ کے سلسلہ میں فاروق اعظم کا فرمان ہے کہ :- "جو بوڑھا کام نہ کر سکے یا اس کو کوئی آفت پہنچے یا مالداری کے بعد فقیر ہو جائے کہ اس

کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس سے جزیہ معاف ہے اور اس کو اور اس کے سارے کنبے کو سرکاری خزانہ سے اخراجات دیے جائیں گے۔ جب تک اسلامی مملکت میں رہے۔ اگر اسلامی مملکت سے نکل جائے تو پھر اسلامی سلطنت پر اس کا خرچ لازم نہیں۔"

(کتاب خراج امام ابو یوسف ص ۸۵)

معاشیاتِ اسلام کا تفصیلی نظام

معاشیات کا تعلق چونکہ انسان سے ہے اور انسان مختلف پہلو رکھتا ہے۔ چونکہ

۱۔ انسان ایک شخصی وجود رکھتا ہے، اس لیے اس کا ایک پہلو انفرادیت کا ہے۔

۲۔ اور اس لحاظ سے کہ ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے اجتماعی تعاون کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اس کا دوسرا پہلو اجتماعیت کا ہے۔

۳۔ اس لحاظ سے کہ وہ زندہ مخلوق ہے اور اس کی بقاءِ حیات کے لیے مخصوص اسباب کی ضرورت ہے۔ اس جہت سے وہ معاشیات کا موضوع ہے۔

۴۔ پھر انسان چونکہ ایک روحانی مخلوق ہے، اس لیے وہ روحانیت کا بھی موضوع ہے۔

۵۔ انسان ایک مخصوص فطرت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ نفسیات کا موضوع ہے۔

۶،۷۔ انسان کو چونکہ کائنات اور خالقِ کائنات دونوں سے تعلق ہے۔

اس لیے انسان کا ایک کائناتی پہلو ہے اور ایک الہیاتی پہلو بھی۔

اب جو مفکر انسان پر صرف معاشی حیثیت سے غور کرے گا، وہ خطرناک غلطی کا مرتکب ہوگا۔ جس طرح اگر کوئی انسان دل کا بھی مریض ہو اور معدے کا بھی، پھر دماغی مرض میں بھی مبتلا ہو، تو جو ڈاکٹر یا حکیم اگر اس کا علاج بحیثیت مریضِ قلب کرے گا اور معدے اور دماغ کے مرض کو نظرانداز کرے گا تو ایسی صورت میں اس انسان کی ہمہ جہتی صحت یابی ناممکن ہے۔ اگر انسانی اعضاء میں بلحاظِ صحت باہمی ارتباط موجود ہے جس کی وجہ سے اس کی کلی صحت تمام اعضائی پہلوؤں کے ممکن علاج کرنے پر موقوف ہے تو ایک انسان کا علاج بھی صرف معاشی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ جب تک اس انسان کا تمام پہلوؤں کے لحاظ سے علاج نہ کیا جاتے۔

اشتراکی اور اکتنازی نظریات میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان مفکرین نے انسان کے صرف ایک پہلو (معاشی) پر نظر ڈالی اور باقی تمام پہلوؤں کو بالکل نظرانداز کیا۔ اس لیے الجھنیں بڑھتی گئیں اور معاشی مسئلہ بھی حل نہ ہوا۔

اسلام کا ہمہ جہتی معاشی حل

اسلام چونکہ دینِ الٰہی ہے جس کو تمام انسانی پہلوؤں پر نظر ہے۔ اس لیے اس نے انسانی انفرادیت کو بھی قائم کیا اور جائز طریقوں سے انسان کو رزق کمانے اور

شخصی ملکیت برقرار رکھنے کی پوری آزادی دی اور کوئی طاقت اس کی اس فطری آزادی کو سلب کرنے کی مجاز نہیں۔ قرآنِ پاک کا اعلان ہے :۔

اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَ اَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی۔	ہر انسان اپنے جائز اکتساب مال کے لیے سعی کرنے میں آزاد ہے اور اس کی کوشش کا ثمرہ صرف اسی کا حق ہے۔

بیہقی کی حدیث ہے کہ :۔

طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ	دینی فرائض کے بعد رزق حلال کمانا بھی انسان پر فرض ہے۔
اِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ	جب نماز سے فارغ ہو جاؤ، تو زمین میں تلاش معاش کے لیے پھیل جاؤ۔

ان ہدایات میں معاشی ضروریات کے لیے سعی و عمل کی دعوت ہے اور عمل کا بڑا محرک فطرۃً شخصی ملکیت کا تصور اور اختصاص و انفرادیت کا جذبہ ہے اس فطری امر کو اسلام نے برقرار رکھا، بلکہ ان ہدایات کے ذریعہ اس کو عمل پر ابھارا۔

اجتماعیت | لیکن انفرادیت کا تقاضا پورا کرنے کے بعد اسلام نے انسان

کے اجتماعی پہلو کے متعلق بھی ہدایات دیں اور اجتماعی دائرے کے فرائض سے بھی اس کو آگاہ کیا۔ اسلام نے انسان کو یہ تصور دیا کہ پوری انسانیت ایک برادری ہے اور ایک ہی کنبہ ہے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (حجرات پ۲۶)	اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا، اور تمہاری قومیں اور ذاتیں بنائیں، تاکہ ایک دوسرے کا حق پہچانو۔

روح المعانی ج ۲۶ ص ۱۶۲ میں ہے کہ :۔

لیعرف بعضکم بعضا فتصلوا الارحام وتبینوا الانساب والتوارث لا لتفاخروا الخ	یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو اور حق قرابت ادا کرو اور انساب پہچان کر میراث کو اس کے مطابق تقسیم کرو۔ نہ اس لیے کہ تم ایک دوسرے پر بڑائی جتلاؤ۔

بیہقی حضرت انس رضؓ سے مرفوعاً حدیث نقل کرتے ہیں :۔

الناس عیال اللہ احب	تمام اولادِ آدم اللہ کا کنبہ ہے

الخلق الی اللہ من احسن — اللہ کو سب مخلوق میں وہی محبوب
الی عیالہ ———— ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ
احسان کرے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ — قابلِ تعریف وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ — اور قانونی واجبات کے علاوہ
اپنے اموال میں سے سائل اور بے مال کو مالی مدد دینا اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں۔ یہی تفسیر مجاہد ابن عباس سے روح المعانی میں مرقوم ہے۔

اب جو قومیں خواہ روس ہو یا امریکہ، وحدت بشری کے اس فطری اجتماعی مسئلہ کو نظر انداز کرے تو اس قوم کی ساری کوشش اس حیثیت سے ہوگی، کہ روسی امریکی قوم سر بلند ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باقی اقوام کو مغلوب اور مفلس اور قلاش بنا کر صرف ایک قوم کا پیٹ بھرنا اس کے پیش نظر رہے گا اور اس کی وجہ سے عام معاشی عالمی حالت خراب ہو جائے گی جیسے آجکل کا مشاہدہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کی رپورٹ کے مطابق نصف انسانی آبادی روٹی سے محروم ہے۔

انسان کا روحانی پہلو

انسان ایک روحانی مخلوق بھی ہے۔ اگر اس کو اللہ سے ربط ہو اور نتائج اعمال اور مکافاتِ عمل کا یقین ہو۔ قلب، بخل، حرص، تکبر اور حبِ ذات اور حبِ قوم کی گندی

آلائشوں سے پاک ہو تو اس کی اپنی معاشی حالت بھی ٹھیک ہوگی اور دوسرے انسانی افراد کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا اور کوئی دوسرا انسان اس کے ظلم کا شکار نہ ہوگا۔ لیکن اگر خود انسانی روح ناپاک ہو تو اس کا وجود دوسرے انسان کے لیے وبال ہوگا اور ہر وقت دوسرے انسان اس کے جانی و مالی مظالم کے تختۂ مشق بنتے رہیں گے۔ قوانین خواہ اچھے ہوں یا برے۔ لیکن ان کو نافذ کرنے والا بہر حال انسان ہی ہوگا۔

جب انسان کی روحانیت بگڑی ہوئی ہو تو قوانین چاہے عادلانہ ہوں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ جس کی چشم دید دلیل دورِ حاضر کی بڑی طاقتیں ہیں جو آئے دن ضعیف اقوام کو تباہ کر رہی ہیں اور ان کو اقوامِ متحدہ نہ روک سکتی ہے اور نہ زبان سے ظالم و جارح کو ظالم و جارح کہہ سکتی ہے۔ خود ویٹ نام میں امریکہ کی تباہ کن کاروائی اور عرب کے خلاف بڑی طاقتوں کے اشارہ پر یہود کے مظالم اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ اقوامِ متحدہ کو زبانی اور قلم ہلانے کی بھی یہ ہمت نہیں کہ برے کو برا کہہ سکیں۔ قرآن نے صحیح فرمایا:۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا — کامیاب ہوا وہ انسان جو روح کو
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا — پاک کرے اور ناکامیاب ہے
وہ انسان جس نے اغراض و مصالحِ دنیوی کی گندگی سے روح کو آلودہ کیا۔

انسان کا نفسیاتی پہلو

انسانی نفس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت

نے انسان میں مال کی محبت رکھی ہے۔ جس کی حکمت یہ ہے کہ اگر انسان میں کلیۃً حبِّ مال نہ ہو تو وہ طلبِ مال چھوڑ دے گا۔ جس سے دنیا کی رونق بھی ختم ہو جائے گی اور چونکہ مال ہی سے انسانی زندگی قائم ہے۔ پس اگر مال نہ ہو تو خود انسان بھی ختم ہو جائے گا۔ یہی وہ فطری محبت ہے جس کو قرآن ان بلیغ الفاظ میں بیان کرتا ہے :۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

اس آیت میں دنیوی محبوبات کی پوری تفصیلی فہرست بیان کی گئی کہ انسان کو فطرۃً انسانوں میں سے بیویوں اور اولاد سے محبت ہے اور جمادات میں سونے چاندی کے انباروں سے اور حیوانات میں عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں سے اور نباتات میں سے کھیت اور فصلوں سے۔

دوسری آیت میں یہ بتایا گیا کہ انسان مال کی محبت میں حد سے زیادہ حریص اور شدید ہے اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ اس لیے معاشی نظام کی درستی کے لیے انسان کے اس نفسیاتی جذبہ کی اصلاح اور اس کو اعتدال پر لانا ضروری ہے۔ جس کے لیے اسلام نے مندرجہ ذیل

ہدایات دیں :۔

مذکورہ فہرست کے بعد قرآن کا ارشاد ہے :۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا	یہ مذکورہ چیزیں چند روزہ فائدہ
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ	اٹھانے کا سامان ہیں اور اللہ کے

پاس وہ چیز ہے جو انجامِ حیات کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوا :۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ	اس دورِ حیات کے فوائد کو تم
الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ	ترجیح دیتے ہو اور زندگی کا اصلی
وَّ اَبْقٰی	آخری دور عمدگی میں دنیا سے بڑھ

کر ہے اور پائیدار بھی ہے۔

قرآن چونکہ خدائے حکیم کا کلام ہے اس لیے وہ نفسیاتی گُر سے واقف ہے کہ مال اور دنیوی فوائد کی فطری محبت توڑی نہیں جا سکتی، البتہ موڑی جا سکتی ہے۔ یعنی اس محبت کا ازالہ نہیں ہو سکتا، البتہ امالہ ہو سکتا ہے یعنی اس محبت کا رُخ ایک بڑے محبوب کی طرف پھیرا جا سکتا ہے اس لیے قرآن نے گذشتہ آیات میں دنیوی نعمتوں کا اخروی نعمتوں کے ساتھ موازنہ کیا کہ اخروی نعمتوں میں بلحاظ انجام حسن ہے۔ لیکن دنیوی نعمتوں کا انجام فنا ہے اور اخروی نعمتیں دنیوی نعمتوں کی بہ نسبت بہتر ہیں اور یہ بہتری اگرچہ

لامحدود ہے لیکن اگر ان دونوں کے تفاوت کو پتھر اور سونے کے درمیان جو تفاوت ہے اس کے مماثل قرار دیا جائے تو بھی کوئی عاقل سونے پر پتھر کو ترجیح نہیں دے گا اور نہ سونے سے پتھر کو زیادہ محبوب سمجھے گا اور دوسرا موازنہ دوام اور ابقاء ہونے کا موازنہ ہے۔ اگر کسی عاقل کو کہا جائے کہ تم اگر چاہو تو میں تم کو ایک من پتھر چند دن کے لیے دوں گا اور پھر واپس لوں گا اور اگر چاہو تو ایک من سونا ہمیشہ کے لیے دوں گا تو یقینی بات ہے کہ چند روز کے لیے پتھر حاصل کرنے کی نسبت دوامی طور پر ایک من سونا کا مالک بن جانے کو زیادہ محبوب جانے گا۔ اس لیے اسلام نے اپنے ماننے والوں کا رُخ دنیا سے آخرت کی محبوبات کی طرف پھیر کر انسان کے اس حرصِ دنیا و لالچ کا خاتمہ کر دیا۔ جس سے انسان کی معاشی حالت پر ضرب پڑتی تھی۔

۲۔ دوسری طرف اسلام نے یہ ہدایت دی کہ انسان کے تمام مفاسد کی جڑ حبّ دنیا ہے۔ ظلم اور دوسرے انسانوں کی حق تلفی، چوری ڈاکہ، سود، رشوت، خیانت، بے اصولی ان سب کا اصلی سبب حبّ دنیا ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے:۔

حب الدنیا راس کل خطیئة

قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

اَمَّا مَنْ طَغٰى وَ اٰثَرَ — جس نے ظلم اور سرکشی اختیار کی

اَلْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ — اور دوسروں کا حق مارا اور آخرت

هِیَ الْمَاْوٰى — کی پائدار اور محبوب زندگی پر دنیا کے

فانی کی حقیر زندگی کو ترجیح دی تو اس نے جہیم اور دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنایا۔

الغرض ان ہدایات نے معاشی لوٹ کو ختم کیا اور انسانی محبت مال کو اپنے دائرہ کے اندر رکھا۔

۳۔ حبّ مال جو انسانی معاشرہ کے لیے منبع فساد ہے، اس کے امالہ کے لیے عملی مشق کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے اسلام نے ایسے عملی قوانین عطا کیے کہ انسانی حرص اور حبِ مال اس کی عملی مشق کی وجہ سے مغلوب ہو اور اس میں بنی نوع انسان پر مال صرف کرنے کی عادت پختہ ہو جائے۔ اس کے لیے قانونِ زکوٰة کے تحت اموالِ تجارت میں نصاب اور سال گذر جانے کی شرط کے تحت اڑھائی فیصد محتاج طبقہ پر صرف کرنا لازم قرار دیا۔ اسی طرح زمینی پیداوار میں اگر آبپاشی آسان ہو تو اس کا دسواں حصہ اور اگر مشکل ہو تو بیسواں حصہ محتاجین کا لازمی حق قرار دیا گیا۔

اسی طرح مخصوص جرائم کے کفارہ کے لیے قانون نافذ کیا کہ اگر روزہ توڑے یا بیوی کو یہ کہہ دے کہ تو میرے لیے ایسی ہے جیسے ماں کی پشت تو ساٹھ محتاجوں کو دو وقت کھانا یا کپڑے دینے پڑیں گے۔ اسی طرح اگر قسم توڑ دے تو اس کے کفارے میں دس محتاجوں کو کھانا یا کپڑا دینا واجب ہو جاتا

ہے۔ اسی طرح اسلام نے صدقاتِ نافلہ کی ترغیب دی بلکہ اس میں اس حد تک ہدایت دی کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو، اس کو محتاجوں پر تقسیم کر دو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ	آپ سے سوال کرتے ہیں کہ محتاجوں
قُلِ الْعَفْوَ ط	پر کس قدر خرچ کریں، کہہ دو کہ

جس قدر مال ضرورت سے زائد ہو۔

انسان کا کائناتی پہلو

انسان کو اس لحاظ سے بھی دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کل کائنات کا ایک اہم جزو ہے۔ جزو ہونے کے لحاظ سے بھی اس کے فرائض ہیں۔ وہ یہ کہ وہ کائنات کے لیے موجبِ تخریب۔ انسان دورِ حاضر کائنات کے لیے تخریب کا سبب ہے۔ اگرچہ اس نے تعمیرِ کائنات میں بھی حصہ لیا اور لے رہا ہے۔ لیکن اس کی تخریب تعمیر پر غالب ہے۔ بالخصوص اس ایٹمی دور میں جبکہ انسانِ جدید نے نہ صرف اہلاکِ انسان بلکہ اہلاکِ نباتات و عمارات، فسادِ آب و ہوا کے لیے وہ خطرناک سامان تیار کیے کہ صرف ایک میزائیل تین کروڑ انسانوں کی تباہی کے لیے کافی ہے اور ایک جراثیمی بم جو تین چھٹانک وزن کا ہے برطانوی سائنس دان کی تحقیق کے مطابق تمام کرۂ ارض کی تباہی کے لیے کافی ہے، جس سے جاندار، بر و بحر، ہوا اور زمین کی قوتِ نامیہ سب تباہ ہو جائیں گے۔ یہ وہ

حکمتِ تخریب ہے ؎

کشد گر واندیشہ پرکارِ مرگ ہمہ حکمت او پرستارِ مرگ

غیر سائنسی دور کے ہزاروں سالوں کی کائناتی تباہی سے دورِ سائنس کی ایک گھنٹہ کی تباہی زیادہ ہے۔ اس تباہی کا لازمی نتیجہ معاشی انحطاط ہے۔ بلکہ اس سے ذرائع معاش اور ان ذرائع سے کام لینے والے انسان سب تباہ ہو جائیں گے اور زمین کاشت کے قابل نہ رہے گی اور پانی میں جراثیم پھیل کر انسانی عیش اور زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور جو چیزیں انسان کے لیے مدارِ حیات ہیں وہ خاکستر کا ڈھیر بن جائیں گی ؎

ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہوا ے اکبر
اڑا جو ذرۂ عنصر وہ پھر سوئے زمین آیا !

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ	تم اس نادان عورت کی طرح مت
غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ	بنو جو اپنی محنت سے مضبوط کاتے
اَنْكَاثًا (پ ۱۴)	ہوئے سوت کو کاٹ کر ٹکڑے

ٹکڑے کرتی تھی۔

انسان کا الٰہی پہلو

انسان کلیۃً آزاد نہیں۔ وہ کائنات کے حاکمِ اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ اس کے ہاتھ میں جس قدر معاشی اور غیر معاشی نعمتیں ہیں۔ وہ اسی حاکمِ اعلیٰ کی امانت ہے اور اسی کے حکم

کے تحت حاصل کی جائیں گی اور اسی کے حکم کے ماتحت صرف ہوں گی۔ اس لیے اس نے اکتسابِ مال پر پابندی لگائی ہے تاکہ سرمایہ دارانہ مفاسد پیدا نہ ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مال حلال ذریعہ سے حاصل کیا جائے نہ حرام ذریعہ سے۔ تاکہ سرمایہ دارانہ طغیان اور سرکشی پیدا نہ ہو۔ اس لیے اس نے وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی تم ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ، کہہ کر باطل کمائی کے تمام دروازے بند کیے۔ خواہ استعمار ہو، استحصال بالجبر ہو، رشوت و سود ہو، ظلم، خیانت، چوری ہو۔

یہ قانونِ اسلامی کی اکتسابی تحدید ہے۔ مجموعۂ دولت چونکہ مجموعہ افرادِ انسانی کا ذریعۂ معاش ہے۔ اگر ایک انسانی طبقہ ناجائز ذرائع سے مال بڑھائے گا تو دوسرے طبقے میں اسی تناسب سے مال کی کمی پیدا ہو گی۔ کیونکہ ناجائز ذرائع کا استعمال دو انسانوں کے درمیان ہے۔ انسان اور غیر انسان کے درمیان نہیں۔ جب ایک طبقہ کے پاس ناجائز دروازے سے مال آئے گا تو جس انسان کے ساتھ اس نے ناجائز معاملہ کیا۔ اس کے پاس مال کی کمی پیدا ہو گی اور توازنِ معاشی بگڑ جائے گا۔

انفاقی تحدید | اسلام نے دوسری تحدید اور پابندی مال خرچ

کرنے پر لگائی کہ وہ ناجائز کاموں میں صرف نہ ہو، جو تبذیر ہے اور نہ بے ضرورت خرچ ہو، جو اسراف ہے۔ بلکہ خرچ میں اعتدال قائم رکھا جائے۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا (پ ۱۵)

تم ناجائز کاموں میں مال صرف نہ کرو کہ ایسے لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان خدا کی نعمت کا ناشکر گزار ہے۔

دیکھیے! قرآن نے اس جرم کے لیے کس قدر سخت لفظ استعمال کیا۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (پ ۱۵)

تم خرچ کے وقت نہ ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھے رکھو کہ ضرورت پر بھی خرچ نہ کرو اور نہ بہت پھیلا کر رکھو کہ غیر ضروری اشیاء پر خرچ کرنے لگ جاؤ۔ پہلی صورت میں بخل کا الزام لگ کر رسوا اور ملامت زدہ ہو جاؤ گے اور دوسری صورت میں خود غریب اور درماندہ ہو جاؤ گے۔

حدیث میں آیا:

الاقتصاد نصف المعیشۃ — خرچ میں میانہ روی آدمی معیشت کو درست کرنا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

البذاذة من الایمان ـــــ سادہ زندگی ایمان کی علامت ہے

خود حضور علیہ السّلام، خلفاءِ راشدین، صحابہ کرام اور مقبولِ بارگاہِ الٰہی نے سادہ زندگی گذاری۔

ان ہدایات کی حکمت یہ ہے کہ جب مال ناجائز محل میں یا بے جا صرف ہوگا تو بچت نہ ہوگی اور وہ محتاج طبقہ پر کچھ صرف نہ کر سکے گا۔ اگر صرفِ بے جا کی وجہ سے مال ہی نہ رہا تو غریب طبقہ کی خبر گیری کیسے کر سکے گا اور محتاجوں پر خرچ کرنے کے لیے اس کا ہاتھ خالی ہوگا۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت کا رُخ بے جا محل سے موڑ کر کارِ خیر، غرباء اور اشاعتِ دین کے کاموں کی طرف متوجہ کر دے اور یہی چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے معاشی حالت میں بھی توازن پیدا ہوگا اور نیکی بھی پھیلے گی، جس سے دنیا بھی سدھرے گی اور آخرت بھی۔

یورپ کے صرفِ بے جا کی تفصیل گذر چکی ہے جو عدمِ توازنِ معاشی کا اصلی سبب ہے۔

تقسیمِ دولت

اسلام نے ایسے قوانین عطا کیے جس سے زندگی میں بھی دولت زیادہ سے زیادہ حرکت کرے اور مرنے کے بعد بھی۔ زندگی میں قانونِ خمس، قانونِ زکوٰۃ، قانونِ عشر و نصف عشر و ربع عشر، قانونِ کفارات قانونِ صدقۃ الفطر، قانونِ ادائے نذور، اعطاءِ سائل و محروم اور اعطاء زائد عن الضرورت ایسے قوانین ہیں جس سے دولت تقسیم ہو کر متحرک ہو جاتی ہے اور

معاشی سطح متوازن ہو جاتی ہے۔ ادیانِ عالم اور قوانینِ انسانیہ میں ایسے مکمل نظام کی نظیر موجود نہیں۔

انسان جب مرجاتا ہے تو یورپ کے قانون میں اکبر الاولاد یعنی سب سے بڑا بیٹا یا بیٹی وارث ہوتے ہیں۔ گویا ایک سانپ خزانے سے ہٹا اور ایک دوسرا اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ باقی رشتہ داروں کو صرف گذارہ دیا جاتا ہے۔ ہندو اور منو دہرم شاستر میں صرف لڑکے وارث ہیں، لڑکیاں وارث نہیں۔ لیکن اسلام نے وراثتی تقسیم کا مکمل نظام مقرر کیا کہ اس میں کل اولاد ذکور و اناث، بیویاں، والدین بھائی بہنیں اور چچے بھتیجے سب حسبِ ترتیب مقررہ حقدار ہوتے ہیں جن کی تین قسمیں ہیں۔ ذوالفروض، عصبات، ذوالارحام وغیرہ۔ میں نے اپنی اردو تصنیف "شرعی ضابطہ دیوانی" میں اس کو مفصل لکھا ہے۔ اگر مذکورہ ورثاء موجود نہ ہوں تو پھر میت کا کل ترکہ بیت المال میں تمام مسلمانوں کا حق بن جاتا ہے۔ یہ مختصر خاکہ ہے جو ہم نے اسلامی معاشی نظام کے سلسلے میں پیش کیا۔

یورپ اور امریکہ نے آخرت اور دین کو تو چھوڑا صرف روٹی کی تقسیم کا مسئلہ ہاتھ میں لیا لیکن اس تقسیم کا جو نتیجہ ہے۔ وہ ہم نے اس مقابلہ میں نقل کیا ہے کہ اقوام متحدہ کی سماجی رپورٹ ہے کہ:۔

"انسانوں کی نصف آبادی بھوک اور امراض میں مبتلا ہے۔"

قرآن نے اعلان کیا کہ:۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ   کہ روٹی کی تقسیم ہم نے کی ہے۔

جس کی تفصیل ہم نے ابھی بیان کی۔ اس لیے اسلام نظامِ معاشی کے دور میں نووی نے شرح مسلم میں تصریح کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز مال کے لیے لوگوں کو بلاتے تھے لیکن کوئی نہ آیا ـــــــ تقسیمِ رزق کا کام تھا اللہ کا جب انسانِ ناقص نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو نصف دنیا بھوکی ہوگئی اور یہ یقینی بات ہے کہ جو کام کمشنر یا گورنر کے کرنے کا ہو۔ اس کو کوئی چپراسی ہرگز انجام نہیں دے سکتا۔ تو آئینِ تقسیمِ رزق جو خدا کا کام ہے، اس کو ضعیف انسان جو خدا سے بدرجہا کم اہلیت رکھتا ہے۔ کیسے انجام دے سکے گا۔ یورپ نے جب تقسیمِ رزق کا مسئلہ ہاتھ میں لیا تو لوگوں کو امید تھی کہ اب روٹی کی فراوانی ہوگی۔ لیکن ہوا کیا۔ بقول اکبر ـــ

تھے فکر میں کیک کے سو روٹی بھی گئی   چاہی تھی بڑی چیز سو چھوٹی بھی گئی
اپنی تو ہوئی وہی مثل اے اکبر   پتلون کے فکر میں لنگوٹی بھی گئی
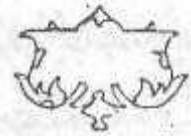
حصّہ چہارم (چند اہم مضامین)

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام پر ایک اصولی سیاسی نظر

اشتراکیت اور سرمایہ داری ایسے دو نظام ہیں جو مادی تہذیب کے فرزند ناخلف ہیں۔ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے چونکہ سرمایہ داری پہلے وجود میں آئی، اور اشتراکیت اس کے بعد۔ لہذا سرمایہ داری مادرِ تہذیبِ مادی کا بڑا بیٹا ہے، اور اشتراکیت چھوٹا۔ ناخلف ہم نے اس لیے کہا کہ یہ دونوں ایک ماں سے پیدا ہونے کے باوجود آپس میں برادرانہ سلوک نہیں رکھتے بلکہ آپس میں برسرِپیکار ہیں اور ان کی باہمی جنگ کا سلسلہ اس طرح جاری ہے، جس کے ختم ہونے کی امید نہیں اور یہ دونوں فرزند اپنی مادرِ مشفقہ یعنی مادی تہذیب کے حق میں بھی ناخلف ہیں کہ مادی تہذیب جو کچھ مادی راحت و آسائش کا سامان مہیا کرتی ہیں اور طویل محنت اور مسلسل جد و جہد سے جو کچھ تعمیر کرتی ہے، یہ دونوں فرزند یا ان کی اولاد اور پیروکار عالمگیر جنگ برپا کرکے اس کو بھسم کر دیتے ہیں اور ماں بیٹوں میں تعمیر و تخریب کی جنگ جاری ہے۔ لیکن تا ہنوز ماں اور بیٹوں کی اس جنگ میں قطعی

فیصلہ نہ ہو سکا۔ تا ہنوز نہ بیٹے پوری طرح تباہ ہوئے اور نہ ماں کا خاتمہ ہوا۔

شاید مستقبل قریب میں مادرِ تہذیب مادی کی اولاد نے جس فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاری کی ہے اور ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور میزائلی نظام سے لیس ہو گئی ہے۔ اس سے آخری فیصلہ ہو گا اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس آخری جنگ میں نہ کوئی فاتح ہو گا نہ مفتوح۔ بلکہ فریقین جنگ دونوں کے دونوں فنا ہو جائیں گے، اور مادرِ تہذیب اپنی ناخلف اولاد سمیت فنا ہو کر رہے گی۔ یہ پیشین گوئی اگرچہ قبل از وقت ہے لیکن وقت بتا دے گا کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہی صحیح نکلا۔ اقبال مرحوم کا بھی یہی اندازہ ہے ــ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اب تہذیب جدید کی حالت نزع اور جان کنی کا وقت ہے لیکن اس قریب المرگ تہذیب پر عاشقوں کا اس قدر ہجوم ہے کہ عالم اسلام کا جدید عنصر اس بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی تہذیب کے اپنانے کے لیے سخت بے چین ہے اور اس کے لیے اپنے تمام تاریخی ورثہ کو قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔

میرا روئے سخن تہذیب جدید کے اپنانے کی طرف ہے نہ کہ ہنرِ جدید کے اپنانے کی طرف کہ وہ خود مسلمانوں کی بقاء کی ایک اہم ضرورت ہے اور اسلامی تعلیم کے زاویۂ نگاہ سے "سامانِ جہاد" میں شامل ہے جو فرض ہے۔

لیکن تہذیبِ جدید اور ہنرِ جدید کا فرق ایسا ہے، جس کو ہمارا عنصرِ جدید نہیں سمجھتا، اور اس کی وجہ سے تقریباً تمام عالمِ اسلام میں قدیم و جدید کی جنگ جاری ہے۔ اور اسی نامعقول جنگ کا نتیجہ ہے کہ کوئی اسلامی حکومت مضبوط اور پائیدار نہیں۔

کاش کہ اربابِ کالج اور اربابِ مدارس ان دو مختصر لفظوں کا مطلب کسی وقت بھی سمجھ جائیں، اور دونوں قوتیں ان دونوں مقاصد کے لیے متفق ہو کر کام کریں۔

۱ــــ ایک طرف تہذیبِ جدید کی ایک ایک برائی کے خلاف قدیم و جدید علوم کے ماہر متفقہ کام کریں۔

۲ــــ دوسری طرف دونوں مل کر ہنرِ جدید کی تحصیل کے لیے جدوجہد کریں۔

تاکہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا خاتمہ ہو اور جذباتی وحیوانی زندگی سے الگ ہو کر، باہمی جنگ و جدال ختم کر کے دین و عقل کی روشنی میں ہر دو دائرۂ کار میں متفقہ اقدام کریں۔ پہلا دائرہ مغربی تہذیب کے خلاف جنگ کا اور دوسرا دائرہ مغربی ہنر کی تحصیل کے لیے جدوجہد کا۔

اگر فریقین ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش کریں تو فکری انتشار اور تضادِ عمل کا فوراً خاتمہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اربابِ اقتدار بھی اسلام کے تہذیبی ورثہ کے تحفظ پر زور دیتے ہیں۔ حال ہی میں مشرقی پاکستان کے گورنر نے

مغربی تہذیب کی مضرت رسانی کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ پر زور دیا۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ اس انتشار کی بڑی ذمہ داری ان چند افراد پر ہے جو فتنۂ استشراق کے شکار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فکری و عملی وحدت پیدا نہ ہو۔ اور کسی وقت بھی وہ طاقتور نہ بن سکیں۔ تاکہ سامراجیوں کا وہ فکری مقصد حاصل ہو، جس کے لیے وہ کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔

مذکورہ مشورے پر عمل کرنے سے زبان و قلم کی جنگ ختم ہو جائے گی اور ایک ایسا مثالی مضبوط اسلامی معاشرہ وجود میں آئے گا جو مادی اسباب، ترقی اور روحانی قوت دونوں کا جامع ہوگا۔

مغربی تہذیب کا اسلامی ممالک میں فاتحانہ داخلہ

یہ ایک بڑا اہم سوال ہے کہ مغربی تہذیب کو اسلامی ممالک میں فاتحانہ کامیابی کیونکر حاصل ہوئی؟ جس سے اسلام جیسے دینِ فطرت کا چودہ سو سالہ ورثہ درہم برہم ہو گیا۔ اس کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ثقافت اور تہذیب کو اپنی پوری تاریخ میں صرف تین معرکے پیش آئے جو بنیادی ہیں:-

۱۔ اسلام کی ایرانی اور رُومی تہذیب سے ٹکر

پہلا معرکہ اسلام کی پہلی صدی ہجری میں دنیا کی دو عظیم

الشان تہذیبوں، ایرانی اور رومی سے "ٹکر" لینے کا معرکہ تھا جس میں اسلامی تہذیب مشرق و مغرب کی دو عظیم قوتوں اور تہذیبوں سے نبرد آزما ہوئی یعنی ایرانی تہذیب اور رومی تہذیب سے۔

جہاں تک مادی اسباب کا تعلق ہے، مذکورہ ہر دو فریق ہر قسم کے سامان سے لیس تھیں لیکن ان کے افکار و نظریات اور تہذیبی زندگی میں جان نہ تھی۔ اسلام نے اپنے فرزندوں کو افکارِ عقائد و اعمال کا وہ استحکام بخشا تھا جس کا جواب ان کی حریف قوتوں کے پاس نہ تھا۔

ثقافت دراصل عقائد و افکار اور سیرت و کردار کی پختگی کا نام ہے جس سے پیدا شدہ جوشِ عمل اور اولوالعزمی کے آگے کوئی قوم ٹھہر نہیں سکتی۔ نہ گانے بجانے، رقص و سرود اور عیاشانہ زندگی کا، کہ جس سے اس مذکورہ بلند اوصاف انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور زنانہ پن اور مشقت گریز جذبہ ابھرتا ہے۔

اس "ٹکر" کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب نے ان دونوں تہذیبوں کو شکست دی اور ان کے مقبوضہ علاقوں کو فتح کر کے اسلامی تہذیب و ثقافت کے رنگ میں ان کو ایسا رنگ دیا کہ آج تک کسی نہ کسی صورت میں وہی اسلامی رنگ باقی ہے۔

۲۔ اسلامی تہذیب کی تاتاری تہذیب سے "ٹکر"

دوسرا معرکہ ہلاکو اور چنگیز کا حملہ تھا جس نے اسلامی ثقافت

سے ٹکرلی۔ یہ دوسرا معرکہ ایسا تھا کہ اس وقت کے مسلمانوں میں اسلامی ثقافت کے عمیق اور گہرے اثرات باقی نہیں رہے تھے۔ ایک حد تک علوم تھے لیکن ایمانی قوت کمزور ہو چکی تھی۔ اسلامی اعمال فسق و فجور اور عیاشی و راحت پسندی کی وجہ سے برائے نام رہ گئے تھے۔ البتہ صرف اسلامی افکار و علوم ان میں باقی رہ گئے تھے جن پر ان کا یقین باقی تھا۔ اور بالمقابل ایسی قوم تھی جو تعلیم یافتہ نہ تھی اور علوم و فنون سے خالی تھی، کوئی فکری تہذیب نہ رکھتی تھی۔ لیکن جوشِ عمل اور اپنے نصب العین پر اس کو پختہ یقین تھا جو اس وقت کے مسلمانوں میں کمزور ہو چکا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ وحشی اور غیر تعلیم یافتہ قوم مسلمانوں کی تعلیم یافتہ قوم پر غالب آگئی اور اس نے اسلامی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن ایک مضبوط ثقافت کے لیے جن پختہ عقائد و افکار اور ان سے متعلقہ علوم کی ضرورت تھی وہ تاتاریوں میں نہ تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تہذیب اور مسلمان قوم اگرچہ بظاہر مفتوح ہوئے لیکن بالآخر فاتح ہوئے۔

تاتاریوں کو جب ان فتوحات کی وجہ سے اسلامی تہذیب اور ثقافت سے روشناسی ہوئی تو اسلامی تہذیب کے اثر سے ان کے دل و دماغ میں تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی اور کعبہ کو دشمنوں میں سے پاسبان مل گئے۔ تیمور اور اس کی اولاد اور عثمانی ترک اسی قوم کے مختلف خاندان ہیں۔ جنھوں نے دور

دراز علاقوں میں اسلام کو پھیلایا اور اسلامی عظمت قائم کی۔

مغربی تہذیب کی اسلامی تہذیب سے ٹکر

تیسرا معرکہ جو اسلام کو پیش آیا وہ مغربی تہذیب اور ثقافت کا مقابلہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر اب تک جاری ہے یہ اسلامی تاریخ میں سب سے شدید تر مقابلہ ہے۔

مغربی تہذیب نام ہے ان افکار و تصورات کا جن کو پوری دنیا میں اہلِ مغرب پھیلا رہے ہیں اور زندگی کے بود و ماند کے ان طریقوں کا جو ان کی عملی زندگی میں موجود ہیں۔ یہ تہذیب عقلی معیار کے اعتبار سے چاہے جس قدر بھی ناموزوں ہو لیکن اس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی قوت ہے اور تعلیم کا ایک وسیع نظام ہے۔ تصنیفات و تحریرات کے بے شمار ذخائر ہیں۔ تصاویر اور فلمی دنیا کا ایک ہمہ گیر جال ہے۔ معاشی اور اقتصادی برتری ہے۔

یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہر بین طبقہ کی نگاہ کو خیرہ کرنے والی ہیں اور اس تہذیب کے علمبرداروں نے خود مسلمانوں کے نژادِ نو میں ایک بڑی با اثر اور با اقتدار جماعت تیار کی ہے جو اسلامی تہذیب کو فنا کرنے میں خود اہلِ مغرب سے زیادہ سرگرمِ عمل ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے نو آزاد ممالک میں مغربی افکار و تہذیب اور اسلامی تہذیب و افکار کے درمیان مسلسل جنگ جاری ہے اور کسی اسلامی ملک کو استحکام نصیب نہیں ہوتا۔ روز نئے نئے انقلاب پیدا

ہوتے رہتے ہیں اور بظاہر اس جنگ کا خاتمہ نظر نہیں آتا۔ تاوقتیکہ فریقین جذبات چھوڑ کر متفقہ طور پر تدبر اور عمیق بصیرت سے کام لے کر اس کا صحیح حل تلاش نہ کریں۔ دونوں جانب افراط و تفریط ہے اور راہِ اعتدال گم ہے۔ لیکن تعلیمِ قدیم کے اربابِ تحقیق میں صاحبِ اعتدال کثرت کے ساتھ موجود ہیں لیکن تعلیمِ جدید والوں میں بہت کم ہیں بلکہ نایاب ہیں۔

یہ بے راہ روی ملتِ اسلام کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ استعماری قوتوں کے لیے مفید ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس جنگ سے مسلمان کمزور ہو کر استعماری قوتوں کے زیرِ اثر آجائیں گے اور مسلمان کے پاس مادی قوت تو مقابلتاً کم ہے جو کچھ ہے وہ ان کی دینی و روحانی قوت ہے۔ اس جنگ سے وہ بھی کمزور ہو جائے گی اور مسلمان استعماری قوتوں کے لیے لقمۂ تر بن جائیں گے۔

قدیم و جدید کی کشمکش کا اصلی حل

اصلی حل کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں طبقے اپنے ذہن میں کچھ تبدیلی پیدا کریں جدید تعلیم یافتہ طبقہ تقلیدِ مغرب کے جذبے سے ہٹ کر عقل و بصیرت سے کام لے کر تنقیدِ مغرب کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرے اور اصلی اسلام کی تحریف کو چھوڑ کر تحقیق کی راہ اختیار کرے اور اسلام کو دشمنانِ اسلام کی تحریروں سے حاصل کرنے کی بجائے اگر ممکن ہو تو خود اس انداز میں اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خود اسلام کیا کہتا ہے اور کیا مطالبہ کرتا ہے؟

اس طرح نہ ہو کہ پہلے خود مغربی افکار کے اثر سے اپنے ذہن میں ایک رائے ٹھہرائی جائے اور پھر اسلام کو توڑ مروڑ کر اس کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر وہ مغربی فکر کی ٹھہرائی ہوئی رائے کے مطابق بننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر یا تو تاویل کے پردے میں اصلی اسلام سے انکار کی راہ اختیار کی جائے یا اسلام کے ابدی دین ہونے کی حیثیت سے انکار کر کے اس کو وقتی قانون قرار دینے کی سعی کی جائے اور اسلام کے چودہ سو سالہ کے عملی اور خارجی وجود کو جس کا تانا بانا ان ہستیوں کے علم و تقویٰ اور مجاہدانہ کارناموں سے بنا ہے کہ ان کا ایک ایک فرد اور اس کی عظمت چند مغرب پرستوں پر کیا بلکہ پورے اہلِ مغرب پر بھاری ہے اور ایسے کروڑوں عظیم ہستیوں کا سمجھا ہوا اسلام جس کے نتیجہ میں اسلام نے مراکش سے انڈونیشیا اور دیوارِ چین تک کی ظلمتوں کو کافور کر کے اپنی روشنی پھیلائی، غلط سمجھ لیا جائے اور اس کے مقابل میں چودہ سو سال کے بعد چند مغرب زدہ مسٹروں نے دشمنانِ اسلام سے تعلیم پا کر صحیح اسلام معلوم کر لیا جو قبل ازیں چودہ سو سال میں کہیں بھی موجود نہ تھا۔

میں حیران ہوں کہ اگر مغرب، جو حالتِ نزاع میں ہے اپنی تہذیب اور اس کے لوازمات کے ساتھ ہائیڈروجن کے طوفانِ فنا میں غرق ہو جائے اور ایک نیا تمدن اور نئی تہذیب پیدا ہو جائے جو مغربی تہذیب سے یکسر مختلف ہو تو یہ حضرات اپنے تحریفی عمل سے اپنی سابق تحریفات او درکار دائیں گے

پر خطِ تنسیخ کھینچیں گے یا اسلام کو دوسری تحریف کے لیے بازیچۂ اطفال بنا دیں گے ؟ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق !

(اقبال ؒ)

قدیم تعلیم یافتہ طبقہ میں جو حقیقی علماً ہیں۔ ان میں تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بدگمانی چھوڑ کر ان سے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ نہ اس لیے کہ حقیقی اسلام کا فہم ان کا ٹھیکہ ہے۔ کیونکہ اسلام میں برہمنیت اور پاپائیت کا وجود نہیں کہ یہ دونوں نسلی نظریے ہیں اور اسلام ان کا قائل نہیں بلکہ اس لیے کہ ہر فن کے لیے معیاری قابلیت کا وجود ضروری ہے جو قدیم طبقہ کے پاس ہے اور جدید کے پاس نہیں۔

لہٰذا دونوں طبقوں کے ممتاز حضرات بیٹھ کر اس امر کی تحقیق کریں، کہ یورپ کے پاس جو کچھ ہے۔ ان میں سے اسبابِ ترقی کی کونسی[1] چیزیں ہیں اور جو چیزیں ترقی سے تعلق نہیں رکھتیں اور اسلامی روح کے لیے[2] مضر ہیں، وہ کونسی ہیں اور جو ترقی سے غیر متعلق ہیں لیکن مباح[3] ہیں وہ کونسی ہیں ؟

اس طرح تین قسم کی اشیاء کی فہرستیں تیار ہوں گی :-

---

[1] حرم مغرب

۱۔۔۔ ترقی سے متعلق اشیاء۔

۲۔۔۔ ترقی سے غیر متعلق اشیاء ممنوعہ

۳۔۔۔ ترقی سے غیر متعلق اشیاء جو مباح ہیں۔

میں نے "ترقی اور اسلام" کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ یورپ کے پاس اسبابِ ترقی میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کا اسلام نے اور قرآن نے چودہ سو سال پہلے حکم نہ دیا ہو۔ اس لیے مغرب زدہ طبقے کا یہ کہنا کہ "اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہ ہم مغربیت کو ترقی کے لیے اختیار کر رہے ہیں"۔ ایسا غلط اور بے اصل دعوے ہے۔ جیسے "دو دونے پانچ"۔

اس لیے ترقی کے لیے پرانے اسلام کی تحریف کی قطعاً ضرورت نہیں اور نہ ایڈیشن اسلام بنانے کی حاجت ہے بلکہ اسی اصلی اسلام کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ مادی اسباب کے ساتھ روحانی جوشِ عمل اور اولوالعزمی ملت میں پیدا ہو اور غیر مسلم ممالک سے درآمد کردہ نظریات سرمایہ داری، سود خواری، جنسی آوارگی، اخلاق کُش طرزِ معاشرت، اشتراکیت، خدا بیزاری اور روحانی اقدار کی تباہی سے ملت کو محفوظ کیا جاتے اور بے راہ روی اور انتشار ان کی وحدت فکر و عمل کو پارہ پارہ نہ کر دے۔

دوسری قسم کی چیزیں جو یورپ کے وہ اجزاءِ تہذیب میں، جن کا تعلق

ترقی سے نہیں بلکہ اسلام اور حقیقی ترقی کے لیے مضر ہیں۔ ان کو اسلامی ممالک اپنی تہذیب میں سے خارج کرنے کے لیے جہاد کرے۔ اور تیسری قسم جو ترقی سے اگرچہ متعلق نہیں۔ لیکن اسلام میں مباح ہیں، ان کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

اس مشترکہ تحقیق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کو یورپ کی گناہگاری کو جو ترقی کے لیے مضر ہے، ترک کرنا پڑے گا اور ان کی صنعت کاری کو جو ترقی میں مؤثر ہے اپنانا ہوگا کہ اس کا حکم تو خود قرآن نے دیا ہے وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ایسی اشیاء کہ جن سے مسلمان طاقتور بن سکتے ہیں، جیسے یورپ کے ٹیکنیکل علوم و فنون۔ ان کو حاصل کرنا مسلمانوں پر اپنی طاقت کی آخری حد تک فرض ہے۔

اگر اقبالؔ مرحوم کے صرف اس کلام کو مدنظر رکھا جائے تو بھی قدیم و جدید کی جنگ ختم ہو سکتی ہے:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است — نہ فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

افسوس ہے کہ ہم نے جدید ایجادات کا نہ تو کوئی قابلِ ذکر سائنس دان پیدا کیا۔ نہ یورپ کی طرح اسلحہ ساز کارخانے بنائے، نہ کوئی مشہور فلسفی اور نہ کوئی ماہر پیدا کیا۔ ہماری ساری قوت تحریفِ دین اور قدیم و جدید کی جنگ پر صرف ہو رہی ہے اور یورپ کے صنعت و ہنر کی جگہ یورپ کی گناہگار تہذیب کو جزوِ زندگی بنانے کی کوشش پر اور اسی کو معراجِ ترقی سمجھ رہے ہیں۔

بہرحال اگر بیرونی ممالک کی تعلیم اس شکل میں حاصل کی جائے کہ وہاں کے وہ علوم جن کو فی الواقع ترقی میں دخل ہے ان میں مہارت پیدا کی جائے۔ لیکن ان کے الحادی اور تشکیکی فلسفۂ حیات سے پرہیز کیا جائے تو قوم روحانی اور مادی دونوں قوتوں سے بہرور ہوگی۔

ہم اگر مادی علوم میں کتنی بھی کوشش کریں پھر بھی یورپ کی نسبت ان علوم میں ہماری حیثیت ثانوی ہوگی۔ لیکن اگر ہمارا دینی اور روحانی جذبہ محفوظ رہے بلکہ اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں تو مادی پہلو کی جو ناگزیر کمی ہے اس کا تدارک ہمارے روحانی جذبہ کی قوت سے ہو جائے گا اور ہم اپنے اسلاف کی طرح اپنی کمزور مادی قوت اور فائق روحانی اور اخلاقی قوت سے اپنے سے بڑی مادی قوت کو شکست دے سکیں گے۔ جیسے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم نے محض ایمانی قوت کے بل بوتے پر اپنے سے فائق تر مادی قوت رکھنے والے ملک بھارت کو شکست دی۔ لیکن اگر ہم ایک طرف مادی قوت

میں بھی کمزور رہے اور دوسری طرف یورپ کے ملحدانہ افکار اور اشتراکیت کے ایمان سوز نظریات نے ہماری رہی سہی ایمانی قوت کو بھی کمزور کر دیا تو اس وقت پاکستان کی حفاظت کس چیز سے ہوگی؟ بالخصوص جب کہ پاکستانی علاقوں کو انتشار سے بچانے کے لیے واحد ذریعہ صرف اسلام ہے۔

اسلامی وحدت

نہ صرف پاکستان بلکہ تمام مسلمان مملکتوں کی حیات و ترقی اور حفاظت کا راز بھی اسلامی بلاک کے قیام میں مضمر ہے۔ اگر امریکہ کی موجودہ شکل میں وہاں کی تقریباً پچاس[۵۰] ریاستوں کا اتحاد ہو سکتا ہے اور سوویٹ یونین کی شکل میں تقریباً بائیس[۲۲] ریاستوں کی متحدہ قوت بن سکتی ہے اور دولتِ مشترکہ کے تحت سات آٹھ حکومتیں باوجود تہذیبی، مذہبی، علاقائی اور نسلی اختلافات رکھنے کے ایک "دولت مشترکہ" کی تنظیم میں آسکتی ہے ——— تو تمام ممالکِ اسلامیہ جن میں دینی، تہذیبی اور تاریخی اسبابِ وحدت موجود ہیں۔ اور زمانہ سابق میں ایک اسلامی حکومت (خلافت) کی وحدت سے منسلک بھی رہے ہیں۔ کیا ان کی یونین یا دولتِ مشترکہ کا بن جانا ناممکن ہے؟ جبکہ ان میں بہت بڑی حد تک جغرافیائی اتصال بھی ہے۔

اگر مسلمانوں نے زمانے کے انقلابات سے سبق سیکھ لیا اور یہ وحدت قائم ہوگئی۔ جس میں اندرونی طور پر تمام ممالک آزاد ہوں اور بتدریج

امورِ خارجہ[۱]، دفاع[۲]، نصابِ تعلیم[۳]، قانون[۴]، تجارت[۵] اور اسلامی اصولوں پر مشترکہ بنک[۶] جیسے اموری اپنے آپ کو ایک مرکزی قوت سے منسلک کردیں تو یہ اسلامی یونین تمام عالمی قوتوں میں اول نمبر کی قوت بن جائے گی اور عالمی امور میں اس کی رائے فیصلہ کن ہوگی اور ان ممالک کے تمام مصائب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بلکہ مغربی اور مشرقی بلاک کے تصادم اور تباہ کن جنگ کو روکنے اور امن عالم قائم کرنے میں یہ ایک مؤثر قوت ثابت ہوگی۔ جس کی بڑی دلیل عالمی اعداد ہیں۔ قوت کی پہلی[۱] چیز عددی برتری ہے۔ روزنامہ کوہستان ۲۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی عالمی تعداد ۹۵ کروڑ اور ایک ارب کے درمیان ہے لیکن عیسائیوں کی صحیح اصلی تعداد پورے عالم میں ۵۲ کروڑ ہے کینوشس مت جو حکمران چین کا مذہب ہے۔ اس کی تعداد ۳۶ کروڑ۔ شنٹو مت جو جاپانی حکمرانوں کا مذہب ہے، اس کی تعداد ۵ کروڑ۔ بدھ مت کے پیروؤں کی ۱۵ کروڑ۔ ہندو بشمول اچھوت کی اصلی تعداد ۲۸ کروڑ ہے (دیکھو مذاہبِ عالم، احمد عبداللہ مسدوسی)

دوسری[۲] چیز رقبہ ہے۔ دنیا کا کل رقبہ تقریباً ۱۳ کروڑ مربع میل ہے۔ جس میں ۴۳ فی صد پر اہلِ اسلام کا قبضہ ہے اور باقی میں سب مذاہب شریک ہیں۔

تیسری[۳] چیز پٹرول ہے۔ روس میں پٹرول کی پیداوار تین کروڑ ٹن

یورپ میں دس لاکھ ٹن اور خیج ۴۱ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن۔ امریکہ کا تیل عالمی پیداوار کا ۱۵ فی صد، روس و چین کا دس فی صد اور مشرقِ وسطیٰ کا ۷۰ فی صد عالمی پیداوار کا ہے (نوائے وقت ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء)

اگر مشرقِ وسطیٰ کا تیل بند ہو جائے تو پورا عالمی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی راز ہے کہ غیر مسلم اقوام سر توڑ کوشش کرتی ہیں کہ عالمِ اسلام متحد نہ ہونے پائے۔ بنو دعرب کا حال دیکھو، کہیں دشمن قومیں ان میں قومیت کا جذبہ انتشار پیدا کرنے کے لیے ابھارتی ہیں اور کہیں اسلام دشمنی کے باوجود اسلامی ممالک میں علاقائی تہذیبوں کو زندہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ اسلام سے ان کے ربط کو پرانی تہذیبوں کے بت کے ذریعہ ختم کیا جائے۔

اب عالمِ اسلام کا فرض ہے کہ ان باتوں میں غور کریں۔ ہم نے تنگ وقت میں صرف مختصر سا خاکہ پیش کیا جس پر اہلِ نظر غور کریں۔

چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

اسلامی یونین

امریکہ کی پچاس ریاستیں ایک وحدت ہے۔ روس کی تقریباً بائیس ریاستیں سوویٹ یونین کی شکل میں ایک وحدت ہے۔ دولتِ مشترکہ برطانیہ تقریباً آٹھ حکومتوں کی ایک وحدت بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ ان میں مذہبی، نسلی اور جغرافیائی اختلاف بھی ہے تو کیا مسلمانانِ ایشیا و افریقہ وغیرہ تقریباً چھوٹی بڑی ریاستیں ایک "اسلامی یونین" نہیں بن سکتی؟ اگر بن گئی تو یہ امنِ عالم کے لیے بھی ایک بے مثال طاقت ہوگی اور عالمِ اسلام کے تمام مسائل بلا جنگ و خونریزی کے حل ہو جائیں گے۔ قوت کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ اس مجوزہ اسلامی یونین کے مقابلے میں کسی حکومت کو دنیا میں حاصل نہیں، صرف وحدت اور تنظیم کا انتظار ہے۔

۱۔ مسلمانوں کی عددی قوت

سب سے پہلے عددی برتری ہے مسلمانوں کو اب تک اپنی صحیح تعداد کا پتہ نہ تھا، کیونکہ وہ اعداد و شمار یورپی ذرائع سے حاصل کرتے تھے جو مصنوعی طور پر کم سے کم تعداد بتلاتے تھے تاکہ کہیں مسلمان اپنی عددی اکثریت معلوم کر کے بیدار نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے مسلمانوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کی کوشش امیر شکیب

ارسلان نے کی اور مذاہبِ عالم میں عبداللہ مسدوسی نے کی۔ کوہستان کی رپورٹ
مندرجہ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ۹۵ کروڑ ہے اور عیسائیوں
کی اصلی تعداد مذاہبِ عالم کی تحریر کے مطابق ۵۲ کروڑ ہے کینفوشس مت جو
حکمرانِ چین کا مذہب ہے، ان کی تعداد ۳۶ کروڑ۔ شنٹومت جو حکمرانِ جاپان
کا مذہب ہے ۵ کروڑ۔ بدھ مت کی تعداد ۱۵ کروڑ۔ اصلی ہندوؤں کی تعداد
۴۸ کروڑ، سکھ ۶۳ لاکھ۔ یہود کی کل عالمی تعداد ½۱ کروڑ ہے۔

اس موازنہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ مسلمانوں کی عددی قوت کیا ہے؟
اور صرف عددی قوت کی وجہ سے روس، امریکہ، بھارت کو پاکستان پر ترجیح
دیتے ہیں کہ بھارت کی آبادی ۵۴ کروڑ اور پاکستان کی ۱۱ کروڑ ہے لیکن وہ صرف
تعداد کو دیکھتے ہیں۔ چاہے ۱۱ کروڑ شیر ہوں اور ۵۴ کروڑ گیدڑ۔

۲۔ پٹرول اور تیل کی قوت کل دنیا کے تیل کا ۵۰ فی صد صرف مشرقِ وسطیٰ
میں پیدا ہوتا ہے جو اسلامی ممالک ہیں۔ اگر یہ
تیل یورپ اور امریکہ یا دیگر ملکوں کو نہ دیا جائے تو وہ نہ لڑائی لڑ سکیں گے اور نہ
کارخانے چلا سکیں گے۔ اس لیے سب کی مشرقِ وسطیٰ پر نظریں لگی ہوتی ہیں
اور اسی کے لیے اسرائیل کو آلۂ کار بنایا گیا ہے

۳۔ رقبہ کے لحاظ سے تفوق تیسری چیز زمین کا رقبہ ہے۔ کل دنیا کا
رقبہ ۱۳ کروڑ مربع میل ہے۔ جس میں ۴۲

فی صد پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ باقی میں تمام اقوام شریک ہیں۔
۴۔ چوتھی چیز ربڑ ہے جو مواصلات کے لیے نہایت ضروری ہے۔ دنیا میں سب سے
زیادہ ربڑ انڈونیشیا اور ملایا میں پیدا ہوتا ہے جو اسلامی ممالک ہیں۔

۵۔ جغرافیائی اتصال یہ عجیب بات ہے کہ اسلامی مجوزہ یونین کے تمام اسلامی
حلقوں میں پاکستان سے لے کر ترکی اور مراکش تک
جغرافیائی اتصال ہے۔ البتہ دلوں کا اتصال باقی ہے جس کا واحد ذریعہ اسلامی تعلیم
اور جذبۂ اسلام کو فروغ دینا ہے۔

۶۔ جذبۂ شجاعت و جفاکشی جس رقبہ میں اسلامی اقوام آباد ہیں۔ ان میں
سب اقوام کی نسبت جذبۂ شجاعت و جفاکشی
زیادہ موجود ہے جو ایک ملت کی قوت اور غلبہ کے لیے سب سے زیادہ فیصلہ
کن معنوی طاقت ہے۔

۷۔ دینِ حق کا جذبۂ توحید ہے جنگ میں فتحیابی جذبۂ دین پر مبنی ہے۔
بالخصوص جب کہ وہ دینِ حق ہو اور اس
میں توحید کی حقیقی اسپرٹ موجود ہو کہ اسباب کے علاوہ ان کو یہ یقین ہو کہ فتح
خالقِ کائنات کی امداد پر موقوف ہے۔ جس کی تمام علوی و سفلی نصرتیں اہلِ حق
کے ساتھ ہوتی ہیں۔ چاہے ان کی تعداد اور سامانِ جنگ دشمن سے کم ہو۔
كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ اکثر چھوٹی جماعت بڑی جماعت

فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ پر میدانِ جنگ میں غالب آتی ہے۔
اگر اللہ کی مشیت ان کے ساتھ ہو۔

پھر جہاد کا یہ جذبہ کہ اسلام کے لیے جہاد بہر حال کامیابی ہے۔ یا فتح ہو گی یا حیاتِ فانی کو حیاتِ اعلیٰ میں تبدیل کرنا ہو گا، اگر شہادت نصیب ہوئی۔ یہ جذبہ اسلامی لشکر کے ہر فرد کو موت سے بے خوف کر دیتا ہے بلکہ موت محبوب بن جاتی ہے۔ مجاہد دشمن کے پہاڑ کی برابر قوت سے ٹکر لینے میں بے باک ہو کر لذت محسوس کرتا ہے۔

عاشقی توحید را بر دل زدن ! — وانگہے خود را بہر مشکل زدن
اگر بیمے نداری بحر صحرا است — وگر ترسی بہر موجش نہنگ است

اس دینی جذبہ کی وجہ سے اسباب اور مسبب الاسباب دونوں کی قوتیں ہر سپاہی میں جمع ہوں گی جس کے سامنے صرف اسباب پر بھروسہ کرنے والی قوم نہیں ٹھہر سکے گی۔

ماضی کی شاندار تاریخ

ایک قوم میں زندگی اور جوشِ عمل پیدا کرنے والی چیز اس قوم کی سابق تاریخ ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخ سے قوم کی زندگی بنتی ہے۔ اسلام کی سابق تاریخ جان فروشی اور قربانی کی ایک بے مثال تاریخ ہے جو کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں۔ اگر اہلِ اسلام کو اپنے ماضی کی تاریخ سے مربوط کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک

مجاہدِ اسلام ہائیڈروجن بم بن جائے گا جیسے ماضی کی تاریخ کا ایک ایک واقعہ اس پر گواہ ہے۔

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں اسے جینا نہیں آیا !

ملتِ اسلامیہ میں بحمداللہ بے مثال بن جانے کے لیے یہ آٹھ اسباب موجود ہیں جو دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہیں لیکن اس قوت کو ہمارے انتشار اور لامرکزیت نے تباہ کر دیا ہے۔ اگر ایک بار اسلامی یونین کی شکل میں یہ قوت منظم ہو جائے تو روس، چین، امریکہ اور یورپ کے فیصلوں کی باگ ڈور اسی یونین کے ہاتھوں میں ہو گی۔

اب ہم اسلامی یونین کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہیں جو عالمِ اسلام کے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ خواہ وہ کشمیر کا مسئلہ ہو یا قبرص کا عرب اسرائیل کا مسئلہ ہو یا نائیجیریا کا۔ جس کا نقشہ حسبِ ذیل ہے۔

مسلم مرکزیت

تمام اسلامی مملکتیں خواہ ان کا نظام جمہوری ہو یا شاہی پھر مغربی جمہوریت ہو یا کسی دوسری قسم کی جمہوریت، نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ وہ ایک مشترکہ پارلیمنٹ سے منسلک ہو جائیں جن میں ہر مملکت سے حسبِ تعداد مملکت نمائندے منتخب کیے جائیں لیکن نمائندوں میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ ان میں حسبِ ذیل صفات ملحوظ ہوں :-

صفاتِ نمائندگانِ پارلیمنٹ

۱۔ اسلام پر پختہ یقین۔

۲۔ جرأت و شجاعت و تدبّر۔

۳۔ عاقبت اندیشی اور سیاسی فہم۔

۴۔ حرصِ مال و جاہ اور ذاتی مفاد اور خود غرضی سے پاک ہونا۔

۵۔ اسلام کی ضروری فہم اور دورِ حاضر کے سامراجیوں کے ہتھکنڈوں اور نفاق سے باخبر ہونا۔

۶۔ اسلامی اعمال کی پابندی۔

ان تمام اسلامی دول کا مندرجہ ذیل امور میں اشتراک ضروری ہے:۔

۱۔ امورِ خارجہ مشترک ہوں۔ ایک کا دوست سب کا دوست اور ایک کا دشمن سب کا دشمن ہو۔

۲۔ دفاع اور دفاع سے متعلق کارخانے مشترک سرمایہ سے بنائے جائیں

۳۔ صنعت مشترک۔ ایسی صنعت جس کے لیے ایک مملکت کا سرمایہ کافی نہ ہو یا خام مواد میسر نہ ہو، ان میں مشترک تعاون سے کام کیا جائے۔

۴۔ تجارت، مصنوعات اور خام اشیاء کا تبادلہ حتی الامکان اسلامی یونین کے دائرے میں ہو اور بتدریج اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ بیرونی درآمد کردہ اشیاء سے بے نیازی ہو سکے۔

۵۔ اسلامی اصولوں کے تحت یونین سے متعلق اسلامی ممالک کی مشترک بینک ہو اور بلا ضرورت غیر ممالک میں سرمایہ نہ رکھا جائے۔

۶۔ نصابِ تعلیم میں کافی حد تک یکسانیت ہو۔

۷۔ عدالتی قانون سب ممالکِ اسلامیہ کا ایک ہو۔

۸۔ اگر ممکن ہو سکے تو اسلامی ممالک کی یونین کی سرکاری زبان بھی ایک ہو اور موزوں یہ ہے کہ وہ عربی زبان ہو۔

۹۔ کوشش کی جائے کہ تبلیغ کی آزادی کے باوجود ایسی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے جو یونین کے بنیادی مقاصد سے متصادم ہوں۔

دورِ حاضر کے افکار کی بنیادی غلطی

سب سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا دورِ حاضر کے نظریات میں غلطیاں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں دورِ حاضر کے نظریات کو تقسیم کرنا پڑے گا۔

۱۔ خالص مادی نظریات:

۲۔ انسان سے متعلق نظریات (خواہ تمدنیات ہوں یا معاشیات وعمرانیات)

۳۔ ماوراء المادیات۔

ان تینوں کے ذرائع علم واحکام وخصوصیات میں بڑا فرق ہے۔ دورِ حاضر کے عقلیت نے تینوں پر بحث کی ہے اور تینوں کے متعلق اس نے نظریات قائم کیے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان تینوں کا ایک بہت بڑی حد تک انسانی زندگی سے تعلق ہے اور تینوں پر عقل نے اس بنا پر غور کیا کہ وہ ایسے حقائق کو پا سکے جن کی وجہ سے انسانی زندگی اپنے حقیقی مقصد میں کامیاب ہو۔ کیونکہ عقل کی فکری حرکت کا آغاز اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

اب انیسویں صدی سے لے کر اب تک تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کی عقلی کاوشوں سے اگر انسان نے اپنے مقصدِ زندگی کو پا لیا ہے تو بے شک یہ فکری وفلسفی اور سائنسی کوششیں قابلِ تحسین ہیں اور اس کی عقل وفکر کی راہیں سمت پر جانے اور منزلِ مقصود کو پانے کی صحیح راہ تھی اور اگر زندگی کا وہ مقصد حاصل نہیں ہوا تو یقیناً ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ انسانی عقلیت کی راہ صحیح نہ تھی۔ بلکہ اس میں غلطی واقع ہوتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس مقصد کو متعین کریں جس کے لیے عقلی حرکات کا آغاز ہوا اور پھر عملی قوتوں نے ان عقلی نظریات کی موافقت کی۔

عقلی وعملی کاوشوں کے مقصد کا تعین

انسانی فکر وعمل کی تمام حرکات کا جو مقصد ہے وہ چین اور اطمینان ہے نہ سونے اور چاندی انبار انبار یا قیمتی موٹریں اور نہ بڑی بڑی بلڈنگ اور سامانِ تعیش یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ جس کی تصدیق اس امر سے کی جا سکتی ہے۔

بے چینی

کہ اکثر اوقات یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں لیکن چین اور اطمینان کا نام نہیں ہوتا۔ اگر یقین نہ آئے تو صدر جانسن اور اندرا گاندھی سے پوچھ لو کہ کیا تم کو ایک معمولی غریب آدمی کے برابر بھی چین حاصل ہے؟ لیکن ان دونوں کی بے چینی عام غریب اور معمولی اشخاص سے بہت زیادہ ہے اسی طرح یورپ اور امریکہ کے ارب پتیوں سے پوچھو کہ تم کو چین حاصل ہے؟

تو جواب ہو گا کہ نہیں۔

آپ نے اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ یورپ اور امریکہ کے بہت کروڑپتی اور ارب پتی ایسے تھے جنہوں نے دماغ کی بے چینی کی تاب نہ لا کر خودکشی کر ڈالی اور یہ تحریر چھوڑ کر مرے کہ:

"ہم اس بے چین دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔"

اب اگر دورِ جدید کے عقلمندوں کی عقلی و عملی تگ و دو کی راہ صحیح ہوتی تو چین حاصل ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف جو بے چینی انسان کو دورِ حاضر میں نصیب ہوتی۔ اس کی نظیر انسان کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتی اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص کر اس ایٹمی دور ہائیڈروجنی خطرہ نے تو بے چینی کو عالمگیر شکل دے دی ہے تو کیا یہی وہ منزلِ مقصود تھی جس کے لیے ڈیڑھ دو صدی کی یہ کوششیں عمل میں لائی گئی تھیں؟

انقلاب

مقصدِ زندگی کی نایابی کی بڑی دلیل لفظِ "انقلاب" ہے جس کے معنی "پلٹنے" کے ہیں۔ اس دور میں جو نظامِ زندگی، جو نظامِ مملکت، جو نظامِ معیشت فکری کوششوں کے بعد قائم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد نعرۂ انقلاب بلند ہو جاتا ہے جس کا واضح مقصد یہ ہے کہ عوام اور نعرۂ انقلاب لگانے والے موجودہ نظام سے مطمئن نہیں، وہ اس کو پلٹ دینا چاہتے ہیں گویا وہ اپنے نعرۂ انقلاب کے ذریعہ اپنی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال مرحوم خدا سے مکالمہ کے ضمن میں اللہ تعالٰے کے اس ارشاد کے جواب میں کہ "کیا یہ جہانِ جدید تم کو موافق ہے؟" کہتا ہے کہ:

"میں نے خدا سے کہا کہ موافق نہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس کو توڑ ڈالو" ؎

گفتا کہ جہان ما آیا بتو مے سازد

گفتم کہ نمے سازد، گفتند کہ برہم زن

بے چینی کی مثال

اس عالمی بے چینی سے یہ معلوم ہوا کہ دورِ حاضر کی فکری اور عملی کوششوں نے زندگی کو مقصود سے ہمکنار نہیں کیا اور تاہنوز زندگی نے اپنے طبعی و فطری مرکز کو نہیں پایا۔

اضطراب، انقلاب اور بے چینی انسان کی باطنی حرکت کا نام ہے اور چین اور اطمینان اس کے اصلی سکون کا نام ہے اور وہی اصل مقصدِ حیات اور راحت گمشدہ ہے۔ مثلاً پانی جب بلندی پر ہو تو وہ متحرک اور مضطرب رہتا ہے اور اگر اس کو اس بلندی سے کسی دوسری بلندی کی طرف منتقل کیا جاتے تو بھی اس کا اضطراب اور تحرک ختم نہ ہو گا تا وقتیکہ وہ کسی نشیب جگہ میں پہنچ کر اپنے مرکزِ فطری و طبعی کو نہ پاتے۔ یہی حاصل اس وقت ہماری زندگی کا ہے کہ عقل اس کو کبھی ایک جہان اور کبھی دوسرے جہان کی طرف منتقل کرتی ہے۔ کبھی تیسری کی طرف۔ لیکن اس کے اضطراب میں فرق نہیں آتا،

تاوقتیکہ زندگی اپنے فطری مرکز کو نہ پالے۔

اس بے چینی کا اصلی سبب خالقِ کائنات سے انسان کے تعلق کا منقطع ہونا ہے اور مادہ اور مادیات ہی سے وابستہ ہونا ہے۔ مادہ متغیر ہے اور روح کے لیے وہ غیر فطری مرکز ہے اور خالقِ کائنات روحِ انسانی کا فطری مرکز ہے۔ رُوح جب فطری مرکز سے ہٹادی گئی اور غیرِ فطری مرکز سے اس کو جوڑ دیا گیا تو اس کے حصے میں دوامی اضطراب اور بے چینی کا ہونا ایک لازمی بات ہے اور مادی ترقی چاہے کس قدر بلند ہو لیکن اضطراب دور نہ ہوگا۔

اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ——— خوب سن لو کہ صرف اللہ کی یاد اور تعلق سے انسان کو چین اور اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

بقول اکبر ؎

دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی — عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد
دنیائے دنی کی ہوس جانے دو — گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ — اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

لیکن تہذیبِ جدید کا یہ حال ہے کہ ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

طریقِ مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور محوِ ماسوا ہونا

مادیات

مادیات کی بنیاد مادہ ہے۔ اس لیے جب تک مادہ معلوم نہ ہو تو مادیات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ مادہ کے متعلق ہزاروں سال سے فلاسفہ کی ذہنی اور فکری کاوشیں جاری ہیں۔ لیکن ان سب میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

مادہ، قدیم فلاسفہ کی نظر میں یونان کے فلاسفۂ قدیم نے مادۂ عالم کی حقیقت کے متعلق جو اسٹیڈی اور تحقیق کی ہے وہ شہرستانی کے ملل نحل میں موجود ہے:

۱۔ فطالیس کی رائے یہ ہے کہ "کائنات کی تخلیق عدم سے نہیں ہو سکتی اس لیے مادہ کا وجود ضروری ہے اور مادۂ کائنات پانی ہے۔

۲۔ انکیمنس کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا مادہ ہوا ہے۔

۳۔ انکسمندر کی رائے یہ ہے کہ مادۂ کائنات کی کوئی شکل نہیں جس کو متعین کیا جا سکے۔

۴۔ فیثاغورث کی رائے یہ ہے کہ مادۂ کائنات خدا ہے۔ جس سے کوئی چیز خالی نہیں۔ جس طرح کل اعداد ایک ہی کے تکرار سے بنتے ہیں اسی طرح خدائے واحد اصلِ کائنات ہے۔

۵۔ اکزنوفس کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا مادہ واحد ہے۔

۶۔ ارعیندس کی رائے یہ ہے کہ عدد مادہ نہیں بلکہ پانی اور ہوا کا مجموعہ مادہ ہے۔

۷۔ ملیسوس کی رائے یہ ہے کہ مادہ ایسی ذات ہے جو زندہ اور عاقل اور ازلی ہے۔

۸۔ ہرقلیط کی رائے یہ ہے کہ مادہ آگ ہے جو پھر منقلب ہو کر ہوا بنی اور وہ بدل کر پانی بنا۔

۹۔ امبدوقلس کی رائے یہ ہے کہ مادۂ عالم چار عناصر ہیں:

ا۔ باد

ب۔ خاک

ج۔ آب

د۔ آتش

ان میں محبت کی قوت باہم انضمام کے لیے اور نفرت کی قوت تفریق کے لیے موجود ہے۔

۱۰۔ دیمقراطیس کہتا ہے کہ مادۂ عالم ذرات ہیں جو اندھی ضرورت کی وجہ سے حرکت کرتے ہیں۔

۱۱۔ انکساغورس کہتا ہے کہ مادۂ عالم ذراتِ متحرکہ ہیں۔ جن کو خدائے

علیم وحکیم حرکت دیتا ہے۔

۱۲۔ سوفسطائیہ جن میں سے بردتاغورث اس کی رائے یہ ہے کہ مادہ یا اور کسی چیز کا کسی کو بھی علم نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عقل اور حس صحیح ذرائع علم نہیں کیونکہ لوگوں کی حالت ان دونوں چیزوں میں متفاوت ہے بلکہ غورجیاس فلسفی کی رائے یہ ہے کہ ہر چیز کی صحیح معرفت عقل اور حس کے ذریعہ محال ہے۔

۱۳۔ سقراط کی رائے یہ ہے کہ مادہ اور دیگر اشیاء کا علم عقل کے ذریعہ ممکن ہے، حس کے ذریعہ ناممکن ہے۔

۱۴۔ افلاطون جو سقراط کا شاگرد ہے وہ کہتا ہے کہ مثالی اور تصوری حقائق مادۂ عالم ہے لیکن افلاطون اور اس کا شاگرد ارسطو دونوں خدا کے قائل ہیں کہ مادہ خدا کے بغیر کسی موجود میں متشکل نہیں ہو سکتا۔

یہ چودہ اقوال قدیم فلاسفہ کے ہیں جو ہم کو معلوم ہیں۔ نہ معلوم کہ اور کتنے اقوال ہوں گے جو ہمیں معلوم نہیں۔

مادہ جدید فلاسفہ کی نظر میں

جدید فلاسفۂ یورپ اور امریکہ کی تحقیقات کو چونکہ استقرار نہیں بلکہ ان میں انقلاب اور تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور جدید تحقیق سابق تحقیق کو رد کرتی ہے۔ اس لیے اب تک جدید فکر میں حسب ذیل تبدیلیاں ہوئی ہیں:

پہلا نظریہ یہ تھا کہ مادہ عناصر کا نام ہے۔

دوسرا یہ کہ مادہ سالمات یعنی ایٹمی اجزاء کا نام ہے۔

تیسرا یہ ہے کہ مادہ برق پاروں کا نام ہے۔

اب تک جدید فلسفہ اسی حد تک پہنچا ہے لیکن جدید فلاسفہ میں سے بعض کی تحقیق یہ ہے کہ:

"بالآخر برقیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور آخر میں صرف ایک نور باقی رہ جاتا ہے۔"

یہ سب خرابی اس غلط جذبے اور تخیل سے پیدا ہوئی کہ عدم اور نیستی سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ لیکن یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے کہ نیست سے ہست نہیں ہو سکتی۔

نیست سے ہست ہونا

اسلامی زاویۂ نگاہ سے کائنات عالم تو ہست سے ہست ہوئی یعنی مادۂ عالم سے وجود میں آئی لیکن خود مادہ عدم سے وجود میں آیا گویا عدم سے وجود اور نیستی سے ہستی کا واقعہ موجودۂ عالم سے قبل صرف ایک بار ہوا۔ ازاں بعد جس قدر قدرت کی تخلیقات ہیں، وہ سب اشیاء ہست سے ہست ہوئیں۔

اب جدید فلاسفہ یا قدیم فلاسفہ جو مادے کی ازلیت کے قائل ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ مادہ اگر ازلی نہ ہو تو وہ بھی پیدا کیا گیا

ہوگا اور ظاہر ہے کہ مادی اجسام تو مادہ سے پیدا ہیں لیکن مادہ عدم سے پیدا ہوا ہوگا۔ حالانکہ مشاہدہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو دستیاب ہو سکتی ہو جو نیست سے ہست ہوتی ہو۔ یہ صرف مغالطہ ہے جو واقعہ مشاہدہ کرنے والوں اور مشاہدات کے وجود سے بہت پیشتر صرف ایک ہی مرتبہ وجود میں آیا ہو۔ وہ اس زمانہ اور اس وقت کیونکر زیرِ مشاہدہ آسکتا ہے۔ جس واقعہ کو جس وقت سے اختصاص ہو، وہ ایک دوسرے وقت میں کیونکر وجود میں آسکتا ہے۔

ایک صاحب نے جو آریہ سماج کے بہت بڑے پنڈت تھے اور اس خیال کے قائل تھے کہ نیست سے کوئی چیز ہست نہیں ہو سکتی ورنہ ہمیں دکھا دو۔ میں نے کہا یہ سوال ایسا ہے کہ بغداد موجود نہیں۔ ورنہ اسی ہندوستان میں بغداد مجھے دکھا دو جب میں مان لوں گا تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ آجاؤ ہمیں بغداد لے چلو وہیں دکھا دیں گے۔ دہلی میں ہم آپ کو بغداد کیسے دکھا سکتے ہیں؟ ہم بغداد کا وجود مانتے ہیں لیکن اپنے اصلی مقام میں مانتے ہیں۔ دہلی میں ہم نے نہ بغداد کے موجود ہونے کا دعوےٰ کیا ہے اور نہ مشاہدہ کا۔ تو اسی طرح مشاہدہ جیسے مکان سے بدلتا ہے اور زمان سے بھی بدلتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ دارا اور سکندر کی جنگ ناممکن ہے ورنہ ہمیں کوئی مشاہدہ اسی زمانہ میں کرائے تو جواب یہی ہوگا کہ یہ واقعہ اپنے مخصوص زمانہ اور وقت میں ہوا۔ تم ہمیں اس زمانے میں پہنچا دو تو مشاہدہ کرا دیں گے۔

اسی طرح جس وقت موجودہ نظامِ عالم سے قبل مادہ نیست سے ہست ہوا تو اس وقت میں ہمیں پہنچا دو تو مشاہدہ بھی کرا دیں گے۔ یہی ہے اس عظیم مسئلہ کی حقیقت، جس پر موجودہ فلسفہ مبنی ہے۔

۲۔۔۔۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان چونکہ کوئی چیز مادے کے بغیر پیدا نہیں کر سکتا تو اس سے خیال قائم کیا گیا کہ خدا بھی نہیں کر سکتا۔ اس نظریہ میں خدا کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کیا گیا ہے۔

یہ بھی بالکل غلط ہے۔ ہمیں خدا سے تو کوئی نسبت نہیں۔ نہ کسی چیز میں شرکت کہ وہ خالق ہے اور ہم مخلوق ہیں لیکن مخلوق میں ایک مخلوق کی قدرت دوسری مخلوق پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ چیونٹی اور ہاتھی دونوں مخلوق ہیں اور دونوں حیوانیت میں شریک ہیں لیکن ہاتھی کی قدرت چیونٹی کی قدرت پر قیاس نہیں کی جا سکتی کہ چونکہ چیونٹی بیس من بوجھ نہیں اٹھا سکتی تو ہاتھی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر کوئی یہ قیاس کرے تو بڑی غلطی کا مرتکب ہوگا۔ چیونٹی جو کام نہیں کر سکتی، ہاتھی وہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم جو کام نہیں کر سکتے کہ نیست سے ہست کریں تو خالقِ کائنات قادرِ مطلق وہ یقیناً یہ کام کر سکتا ہے۔

۳۔۔۔۔ سائنس کے قواعد کے مطابق مادہ کی ازلیت کا تخیل استقرا اور تجربہ سے قائم کیا گیا اور استقرا اس وقت دلیل بن سکتا ہے کہ تام ہو۔ ورنہ بہت زمانہ تک سینما میں تصاویر متحرک نظر آتی تھی لیکن بولتی نہ تھی۔ اس وقت کا استقرا یہ

تھا کہ تصاویر سینما نہیں بول سکتیں۔ لیکن مابعد زمانہ میں جب بولنے لگی تو وہ استقرار باطل ہوا کیونکہ یہ جدید واقعہ سابق استقرار و تجربہ کرنے والوں کے تجربہ سے خارج تھا تو ممکن ہے کہ کوئی ایسا صحیح واقعہ بھی ہو جو انسان کے تجربات سے خارج ہونے کے باوجود اپنی جگہ دو دونی چار کی طرح صحیح اور درست ہو اور وہ واقعہ نیست سے ہست ہونے کا ہے۔ اسی طرح تمام عجائبات سائنس سابق تجربہ سے خارج تھے۔ لیکن اب یہ تسلیم شدہ ہیں۔

بہ ـــ مادی اجسام مادہ سے پیدا ہوئے اور خالق کائنات نے پیدا کیا۔ اب خود مادہ اگر کسی اور مادہ سے پیدا ہو تو تسلسل لازم آئے گا۔ لہٰذا خود مادے کا وجود کسی اور مادہ سے نہیں بنا، ورنہ پھر اسی دوم مادے سے متعلق سوال چلے گا جو ختم نہ ہوگا۔ لہٰذا اس لحاظ سے کائنات مادی ہے۔ اس کے لیے مادہ ضروری ہے لیکن خود مادہ غیر مادی ہے جس کے لیے اور مادے کی ضرورت نہیں۔

باقی اگر اس میں شبہ ہو تو خود انسانی آنکھ کے ابصار اور مشاہدہ کو دیکھو کہ تمام کائنات کا ابصار و مشاہدہ آنکھ کے ابصار سے ہوتا ہے لیکن خود ابصار مبصرات سے نہیں یعنی کل چیزیں ہم نظر سے دیکھتے ہیں لیکن خود نظر، نظر نہیں آتی اور نظر کا وجود نظر آنے سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح کل مادیات مادے سے بن گئے ہیں لیکن خود مادہ مادہ سے بے نیاز ہے کہ وہ کسی اور مادہ سے

بن گیا ہو۔ بلکہ وہ بلا مادہ وجود میں آیا ہو۔ البتہ وجود میں لانے والے خدا کی ہستی لازمی ہے یعنی مادے کے لیے دیگر مادہ کی ضرورت نہیں البتہ فاعل و خالق کی ضرورت ہے۔

پہلی قسم یعنی افکار جدیدہ جو مادیات سے متعلق ہوں۔ ان میں اکثر آراء صحیح ہو سکتی ہیں کہ وہ مشاہدہ اور تجربہ سے متعلق ہیں اور مادہ چونکہ بے جان اور بے اختیار چیز ہے اس لیے مادہ سے متعلق ایک بار بعد از تجربہ جو نظریہ قائم ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی اور قائم رہتا ہے مثلاً اگر دو سالمات (ایٹم) ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک سالمہ کو ترتیب دی جائے تو ہر حال میں اس عمل سے پانی برآمد ہوگا۔ اس لیے اس قسم میں اختلاف کی گنجائش کم ہے اور ہم آسانی سے حکم لگا سکتے ہیں کہ فلاں مادی شے سے فلاں حالات و شرائط کے تحت فلاں خاصیت ظاہر ہوگی۔

عالمِ انسان سے متعلق علوم

لیکن دوسری قسم یعنی عالمِ انسان کے متعلق کسی نظریہ کے متعلق ہم قطعی حکم نہیں لگا سکتے، کیونکہ اس میں قطعی اسباب و نتائج کا حکم لگانا اس لیے دشوار ہے کہ انسان مادہ کی طرح مجبور و بے اختیار چیز نہیں کہ مجبوراً کسی قانون کا محکوم ہو بلکہ اس کا آزاد ارادہ ہر قانون کو توڑ سکتا ہے اور اس کا اختیار علت و

معلوم کے سلسلے کو درہم برہم کرسکتا ہے اور قطعی علت کا تعین مشکل ہے۔ مادہ سے متعلق نظریے سے اگر کوئی انکار کر دے تو تجربہ اور مشاہدہ سے اس کو قائل کیا جا سکتا ہے لیکن انسان سے متعلق امور ایسے نہیں۔

مثلاً گذشتہ جنگ میں فرانس کی شکست کا سبب اشتراکیوں کے ہاں سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ آمریت پسند کہتے ہیں، شکست کا سبب فرانس کا جمہوری نظام تھا۔ پابند مذہب طبقے کے نزدیک شکست کا سبب فرانس کا اخلاقی انحطاط تھا۔ لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں، کہ ہم کسی ایک سبب کی صحت کو قطعی طور پر ثابت کرسکیں۔

نتائج امور انسانیہ کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً انسانی علوم کے متعلق عام قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک قوم شکست کھاتی ہے تو اس میں مادی اور اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے لیکن گذشتہ جنگ میں جرمنی نے شکست کھائی اور اس کی مادی قوت اور اخلاقی عزیمت اور ہمت میں ترقی ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قسم اول یعنی مادہ کے برخلاف اس قسم دوم یعنی انسانی فطرت کے قوانین اتنے غیر متعین اور نامعلوم ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں معاملۂ انسانی سے فلاں وقت فلاں نتیجہ برآمد ہوگا۔ لیکن عصر جدید کی عقلیت نے انسانی امورات خواہ وہ تمدن ہو یا معاشیات یا عمرانیات کے متعلق جو

نظریئے قائم کیے اس پر مادیات کی طرح یقین کرنے لگی۔

حالانکہ یہ معلوم ہے کہ عالم طبیعی میں حق وصداقت کا پانا جس قدر آسان ہے، تمدنی اور معاشرتی امور میں جو انسان سے متعلق ہیں اتنا ہی مشکل ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مادیات اور طبیعیات کا تجربہ کرکے جو رائے قائم کرتا ہے۔ اس میں تجربہ کنندہ انسان خالی الذہن اور غیر جانبدار ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ انسانیت کے میدان میں قدم رکھتا ہے اور تمدنیات اور معاشریات کو سوچتا ہے تو اس کا ذہن ان چیزوں کے متعلق پہلے سے ایک خاص عقائد و تصورات رکھتا ہے اور اس کی قوم بھی ان چیزوں کے متعلق ایک خاص عندیہ رکھتی ہے۔ اس لیے وہ شخصی و قومی خصوصیات سے الگ ہوکر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ وہ جملہ امورات کی چھان بین اپنے شخصی و قومی مزاج کے تحت کرتا ہے جس کی وجہ سے حقیقت تک رسائی عقلیت کی راہ سے مشکل ہو جاتی ہے اور تمدنی اور معاشرتی مسائل میں عقلیت کو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم مان بھی لیں کہ مادی اور تمدنی مسائل کے اس واضح فرق کے باوجود ہم حقیقت کو پا بھی سکتے ہیں تو دیگر اقوام کو ہم کسی دلیل سے قائل نہیں کرا سکتے اور تاوقتیکہ انسانوں کے پاس تمدن کا ایسا مضبوط اساس موجود نہ ہو جس پر سب اقوام کا اتفاق ہو تو تمدن کو پائیداری نہ ہوگی اور اس کی جڑیں ہر وقت ہلتی رہیں گی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ اعتراض کہ اس واضح فرق کو حکمائے مغرب نے کیوں نہ سمجھا اور کیوں بے ہودہ طور پر انہوں نے اپنی عمریں اور محنت تمدنی اور معاشرتی مسائل میں صرف کی۔ اس کی وجہ اور جواب عقلیت کی نشاۃِ جدیدہ کی تاریخ سے نمایاں ہیں کہ عقلیتِ جدیدہ کو مسیحیت سے جو اس وقت عقل کی راہ میں رکاوٹ تھی اور اس کی بنیادی مسائل مثلاً الوہیتِ مسیح تین ایک اور ایک تین اور مصلوبیتِ مسیح پر ایمان لانے سے گناہوں کا کفارہ ہونا چند نامعقول امور کا مجموعہ تھے۔ ان سے عقلیت کو ٹکر ہوتی اور جب عقلیت کو فتح ہوئی تو انہوں نے تمام ادیان کا خواہ محرف اور غلط ہوں جیسے مسیحیت یا حق اور فطری ہو جیسے اسلام، سب کا انکار کیا اور سب سے پہلے انتقام لینا چاہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمدنی اساسات کا الہامی دروازہ انہوں نے بند کیا اور عقل کی راہ سے تمدن کو بھی حل کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی تمدن الہامی بنیاد کو اور خدائی اساسات اور بنیادوں سے ہٹ کر عقل کی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ جس کی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ عقل کے پاس موجود نہ تھا اور نہ عقل جذبات و میلاناتِ نفسی کی دخل اندازی سے خالی ہو سکتی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عقلیتِ جدیدہ نے ایک ایسا تمدن قائم کیا۔ جس میں حرص و خواہشاتِ نفس کی تکمیل اور درندہ صفت خونریزی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور

انسانی تمدن جاہلانہ دور کے تمدن سے بھی زیادہ پستی میں جا گرا۔ کیونکہ جاہلانہ دور تمدن میں بھی کچھ نہ کچھ الہامی بنیادیں موجود تھیں اور تعجب یہ ہے کہ اس بر خود غلط اور غیر فطری تمدن کے استحکام میں روز بروز اضافہ کی کوشش کی جاتی رہی۔ جس سے اس کے زخم اور بڑھتے ہیں۔ جیسے بقول مولانا روم:-

"جو کانٹا قدم میں چبھ گیا ہو اور صاحبِ قدم چھٹکارا پانے کے
لیے اس کو زور سے زمین پر مارے تو قدم زیادہ زخمی ہوگا۔"

تمدنِ حاضر زندگی کے قدم کا کانٹا ہے۔ جتنا قدم زمین پر مارا جائے گا اتنا کانٹا مضبوط ہو کر قدم مزید زخمی کرے گا۔ اصلی علاج یہ ہے کہ ہوشیار آدمی اگر کانٹے کو نکال کر دور پھینکے نہ کہ اور اس کو مضبوط کر دے۔

ان انسانی اور تمدنی مسائل میں جدید عقلیت کی جذباتی لغزشوں اور غلطیوں کے لیے عورت کے مسئلے کے متعلق ان کی آرا ملاحظہ ہوں۔ جن سے ان کی لاعلمی نمایاں ہے۔

عورت اور مغرب

سب سے پہلے فکرِ جدید نے عورت کو انسانی حقوق سے محرومی کی بنیاد پر اپنے تمدن کی بنیاد قائم کی اور یہ قانون بنایا کہ:-

۱۔ "عورت شادی کے بعد اپنے پدری اقارب سے کٹ کر شوہر کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ اس کی تمام ملکیت شوہر

کی ہے اور وہ خود کسی چیز کی مالک نہیں بن سکتی اور نکاح ہونے کے باوجود جب تک رخصتی نہ ہو تو خاوند کی ملکیت سے اس کا تعلق نہیں اور خاوند کے مرنے پر وہ وارث نہیں ہو سکتی۔

۲— شادی شدہ عورت کو جب شوہر کے گھر میں نہ ہو اپنی اولاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ماں مرگئی یا اس کی اولاد تو ان کے درمیان وراثت نہ ہوگی۔ بلکہ کنبہ کا رئیس اور سرپرست سب چیز کا حقدار ہے۔" قانون روما المقارنات التشریعۃ بین القوانین الوضعیۃ المدینیۃ والتشریع الاسلامی۔ سید عبداللہ صـ۱۸۱)

۳— عورت کو خرید و فروخت اور کسی معاملہ کا اپنی ملکیت میں بھی شوہر کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔

۴— عورت کے املاک پر شوہر کا تسلط حاصل ہے۔ وہ خرید و فروخت اور شرکت کا اختیار نہیں رکھتی۔" (حوالہ مذکورہ، قانون فرانس صـ۱۸۲)

۵— عورت کسی معاملہ میں مدعیہ یا مدعیٰ علیہا نہیں بن سکتی اور نہ عدالت میں حاضر ہو سکتی ہے۔ جب تک شوہر کی اجازت نہ ہو۔" (حوالہ بالا صـ۱۸۱)

عقلیتِ جدیدہ نے ان قوانین کے تحت عورت کو بے بس جانوروں

کی طرح بے اختیار اور شوہر کی ملکیت قرار دیا۔ لیکن بعد ازاں عقلیتِ جدیدہ کا یہ تفریطی جذبہ جب افراطی جذبہ میں تبدیل ہوگیا تو تمدن کی بنیاد عورت کی حریت اور کلی آزادی پر قائم کی گئی اور اس کو مردوں کے ساتھ تمام امور میں مساوی قرار دیا۔

اب عورت کو بلا اجازتِ شوہر ہر مرد سے خلوت و جلوت میں ملنے کی آزادی حاصل ہوئی اور جس قدر شوہر کماتا تھا، عورت بھی اسی طرح کمانے لگی اور ازدواجی رشتہ اس قدر کمزور ہوا کہ عورت جب چاہے کسی خوب صورت اور مالدار شخص سے تعلق قائم کر کے شوہر سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عائلی زندگی کا تمدنی نظام درہم برہم ہوا۔ بعض شوہر عورتوں کی اس بغاوت سے تنگ آ کر خودکشی کرنے لگے اور مشہور لڈوسی نے "وومین (WOMAN)" نام کتاب عورت پر لکھی، جس میں یہ فیصلہ کیا کہ

"یورپ کی عائلی تباہی کا علاج اب صرف یہی ہے کہ عورت کو دانایانِ مشرق کے قواعد کے تحت دوبارہ کنٹرول کیا جائے۔"

لواطت

لواطت کو تمدن کے لیے تباہ کن سمجھ کر عقلیتِ قدیمہ کا پہلا تمدنی قانون یہ تھا کہ اس فعلِ خبیث کو جرم قرار دیا جائے اور قرار دیا گیا۔ لیکن عقلیتِ جدیدہ کی عطا کردہ بے لگامی نے یورپ کو اس فعلِ بد کی وجہ سے سدوم اور عمورہ بنایا تو خود برطانوی پارلیمنٹ کے مادر پدر آزاد ممبران نے لواطت کو جائز قرار دیا اور "ملکہ الزبتھ" کے دستخط سے اس کو ملک کا

قانون بنادیا گیا۔

کیا ان واقعات سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ تمدنی مسائل کی پیچیدگی عقل حل نہیں کرسکتی۔ اس میں الہامِ ربانی کی ضرورت ہے۔

بقولِ اقبال ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرے میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

عقلیّت جدیدہ اور ماوراءُ الطّبیعات

ماوراءُ الطّبیعات سے وہ حقائق مراد ہیں جو مادی تجربات سے خارج ہوں اور انسان عقل اور حواس یا وجدان کے ذریعہ ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ کرسکتا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی تجربہ کے لیے دو امر ضروری ہیں:

۱۔ اتحادِ زمانی اول یہ کہ ان امور کو انسان سے اتحادِ زمانی ہو۔ یعنی تجربہ کنندہ انسان اور وہ زیرِ تجربہ امور ایک وقت میں موجود ہوں۔

(الف) مبداءِ عالم اس اصول کے تحت قبل الانسان یا مبداءِ انسان سے متعلق امور سائنسی دائرہ سے خارج ہیں یعنی یہ فیصلہ کہ انسان سے پہلے کیا تھا یا انسان کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے ذرائع معلومات سے خارج ہونے کی وجہ سے انسان کے لیے غیبات ہیں۔ نہ وہ اپنے آغاز کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرسکتا ہے اور نہ آسمان و زمین، آفتاب و ماہتاب اور سیّارگان کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرسکتا ہے۔ اگر کوئی رائے قائم بھی کرلے تو وہ اٹکل پچو اور تخمینی اور خیالی رائے ہوگی نہ حقیقی۔

قرآن نے اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے:۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا

میں نے ان منکرین کو نہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت حاضر کیا تھا اور نہ انسان کی پیدائش کے وقت اور نہ میں نے ایسے گم راہ افراد کو تخلیقی رازوں کا دست و بازو بنایا تھا۔

(ب) منتہی انسان

اسی اصول کے تحت بعد الانسان اور موت انسان کے بعد کے واقعات جس کو منتہائے انسان کہنا چاہیے۔ انسان کے ہم زمان نہیں یعنی انسان ان کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ عالمِ قبر و برزخ ہو یا عالمِ آخرت، دونوں انسانی تجربات اور سائنس کی دنیا سے خارج ہیں۔ اس لیے انسان کی رائے ان امور کے بارے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

۲۔ روحانیات

دوسرا امر یہ کہ وہ کثیف اشیاء ہوں۔ لہٰذا وہ لطیف اشیاء ہیں جن تک انسانی تجربات اور تحلیل و تجزیہ کی رسائی نہیں۔ وہ تجزیہ و تحلیل سائنس کے دائرے سے خارج ہیں۔ ایسی چیزیں خالقِ کائنات کی ذات، ملائکہ، ارواحِ انسان، عقائد و اخلاق و اعمالِ انسانی کا حسن و قبیح اور انسان کی پوری زندگی کے تمام دائروں میں (دنیا قبر و آخرت میں)، ان کے نفع و ضرر کی تعیین اور ان کے حدود کی تشکیل،

انسانی یا سائنسی تجربات سے خارج ہیں۔ اس لیے انسان ان تک رسائی پانے سے قاصر ہے۔ بلکہ ان تینوں چیزوں مبدءِ انسان، منتہاءِ انسان، روحانیات لطیفہ نہایہ کا ذریعہ صرف وحیِ الٰہی اور الہامِ ربانی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسان ان کو حاصل کرسکتا ہے اور حاصل ہونے کے بعد وہ انسانی ذرائع سے متصادم نہیں بلکہ انسانی ذرائع علم کے موافق ہیں۔

مثلاً کان سے آوازوں اور تقریروں کا علم ہوتا ہے اور آنکھوں سے رنگوں اور اشیاء کے چھوٹے بڑے ہونے کا علم۔ اب کان آنکھ کی معلومات سے عاجز ہے اور آنکھ کان کی معلومات سے، لیکن ان دونوں الگ الگ دائروں کی معلومات میں تضاد تخالف و تصادم نہیں۔ اسی طرح حسّ عقل کی معلومات سے قاصر ہے اور عقل حسّ کی معلومات سے۔ لیکن دونوں میں ٹکر نہیں۔

یہی حال حسّ و عقل کو وحیِ الٰہی کے ساتھ ہے کہ یہ دونوں قوتیں وحی کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات تک رسائی نہیں پاسکتیں لیکن ان دونوں کے علوم کو وحی کی معلومات سے کوئی تصادم نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسِّ صحیح اور عقلِ سلیم اور وحی کی معلومات میں تصادم ناممکن ہے۔ کیونکہ دو صحیح چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہوتیں۔ اس لیے مذہب اور سائنس میں تصادم کا امکان ہی نہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ سائنس دائرۂ مذہب تک پرواز ہی نہیں کرسکتی۔

اگر سائنس مذہب دشمنی کے انتقامی جذبہ کے تحت مذہبیات میں مداخلت کرنے لگے تو خود سائنس انسانیت کے لیے باطنی زہر بن کر انسانیت کی تباہی پر منتج ہوگی۔ جیسے دورِ حاضر کی سائنسی کج دماغی اور بے راہ روی سے ایسا ہو رہا ہے۔

لامارک (LAMARCK) کا نظریۂ ارتقاء

اور

چھ دلائل سے اس کی تردید

سب سے پہلے لامارک (LAMARCK) نے ثابت کیا کہ عملِ ارتقاء خارجی قوتوں کا اثر نہیں۔ بلکہ جب کسی نوع میں پُرزور خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندرونی مہیجات سے ارتقاء شروع ہو کر نشو و نما پاتی ہے۔

اس نے بچے کی مثال دی کہ پیدائش سے کچھ عرصہ بعد بچہ میں یہ خواہش جوش مارتی ہے کہ وہ بھی اپنے بڑوں کی طرح اپنے پیروں پر چلنے لگے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف انواع نے درجہ بدرجہ نیچے سے اوپر تک بلند نوع کی شکل اختیار کی۔ اسی طرح اونٹ کی گردن پہلے دیگر حیوانات کی طرح چھوٹی تھی لیکن جب درختوں کے نچلے پتے دیگر حیوانات نے کھا لیے تو غذا کی ضرورت سے ان میں لمبی گردن ہونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس کی گردن لمبی ہوگئی۔

دلیلِ اوّل: انسان کو ارتقائی مخلوق ماننے کی یہ توجیہ جو لامارک نے کی۔ مجنوں کی بڑ سے زیادہ نہیں۔ ادنیٰ درجے کی مخلوق جماد ہے، پھر نبات

پھر حیوان، پھر انسان ہے۔ جماد میں تو سرے سے خواہش ہی موجود نہیں کہ
وہ ارتقاء کا سبب بنے۔ نبات اور حیوان میں اگر کسی قسم کی خواہش موجود بھی
ہے تو وہ اس قدر باشعور کہاں ہے کہ وہ کسی بلند نوع کی بلندی اور برتری
کو معلوم کر کے اس کی پرجوش خواہش کرے۔

دلیلِ دوم: خواہش کے لیے تصورِ کامل کی ضرورت ہے۔ ہم آم کھانے
کی خواہش یا گورنر بننے کی خواہش اس وقت کر سکتے ہیں کہ ہمیں آم اور گورنری
کے متعلق پورا علم ہو، تصور ہو۔

دلیلِ سوم: یہ کہ خواہش کے لیے اسبابِ ممکنہ کی ضرورت ہے جو
پست درجہ کی نوع میں موجود نہیں تو وہ ایک بلند نوع کی طرف ارتقاء کی
خواہش کیونکر کر سکتی ہے، جب کہ تکمیل خواہش کا سامان موجود نہ ہو، کیا ایک
بے تعلیم آدمی یہ خواہش کر سکتا ہے کہ وہ چیف انجینئر یا سول سرجن بن جائے؟
اونٹ کی مثال میں اونٹ کے پاس گردن کی لمبائی کے لیے کیا اسباب
تھے جو اس نے گردن لمبی ہونے کی خواہش کی؟ باقی بچے کی مثال میں
ضعف سے قوت کی طرف انتقال خود بچے کی فطرت کا لازمی نتیجہ ہے کہ
وہ فطرۃً بتدریج نشو و نما پاتا ہے۔ اس میں خواہش کا دخل نہیں۔ اگر خواہش
نہ کرے جب بھی مقررہ وقت پر اپنے پاؤں سے چلے گا۔

دلیلِ چہارم: چوتھی بات یہ ہے کہ ادنیٰ نوع مثلاً حیوانِ مطلق سے

انسان بن جانا۔ اگر حیوان کی کسی نوع کی خواہش کا نتیجہ ہو تو اس کو انسانی صورت،
انسانی ڈھانچہ اور انسانی صفات و خصوصیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ لیکن
اس وقت تو انسان وجود میں نہیں آیا تھا تو اس نے انسانی حقیقت کو
کیسے جانا کہ اس کی طرف ارتقاء کرنے کی خواہش اس میں پیدا ہوئی۔

دلیلِ پنجم: پانچویں بات یہ ہے کہ انسانی کمالات اس پست نوع میں
موجود نہیں تھی تو منفی سے مثبت کیسے وجود میں آیا۔ جب کہ صرف طبعی ارتقاء
سے ایسا ہوا اور فاعلِ حکیم یعنی خالقِ کائنات کا عمل اس میں مؤثر نہیں تھا۔

دلیلِ ششم: چھٹی بات یہ ہے کہ انسان بن جانے کے بعد ارتقاء
کیوں رک گیا؟ اور اس سے آگے چل کر کسی اور اکمل نوع کی طرف ارتقاء
کیوں نہیں ہوا؟ بلکہ یہ عمل ارتقائی مسلسل جاری رہنا چاہیئے۔ خواہ نمونہ
موجود ہو یا نہ ہو۔

جماد کے وقت نبات نہ تھا۔ نبات کے وقت حیوان نہ تھا حیوانِ
مطلق کے وقت انسان نہ تھا اور درمیان میں کسی خالقِ حکیم کا دخل و عمل بھی
نہ تھا۔ تاکہ کچھ وقت تک ارتقائی عمل کرتا اور پھر اپنے ارادے سے اس کو
بند کرتا بلکہ یہ سب کچھ صرف طبعی رفتار سے ہوا تو انسان پر پہنچ کر کیوں ارتقائی
عمل ختم ہوا؟

ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور اُس کی تردید

ڈارون نے بھی عالمِ فطرت کی تخلیق کی۔ توجیہ لامارک کی پیروی میں ارتقاء کے نظریہ کے تحت کی۔ لیکن اس کا ارتقاء لامارک کے ارتقاء سے مختلف ہے۔

ڈارون نے اپنا ارتقاء تنازع للبقاء، انتخاب طبعی اور بقاءِ اصلح کے اصول پر قائم کیا۔ اس کا دعوےٰ ہے کہ فطرت صرف اسی نوع کو باقی رکھتی ہے جس میں بقاء کی صلاحیت ہو۔ باقی تمام انواع رفتہ رفتہ فناء ہو جاتی ہیں اور فطرت انتخاب طبعی کے اصول کے تحت صرف انہیں انواع کا انتخاب کرتی ہے، جو اس معیار پر صحیح اتریں، باقی کو فناء کرتی ہے اور اسی نتیجہ کا نام بقاءِ اصلح ہے۔ اور انواع کی باہمی کشمکش کا نام تنازع للبقاء ہے۔

اونٹ کی مثال کی اس نے یہ توجیہ کی ہے کہ لمبی گردن اونٹ کی خواہش کا نتیجہ نہیں بلکہ ابتداء میں دونوں قسم کے اونٹ موجود تھے۔ چھوٹی گردن والے بھی اور لمبی گردن والے بھی۔ دونوں میں تحصیلِ غذاء کے لیے کشمکش رہی جب نیچے کے پتے اونٹوں نے کھا کر صاف کر دیئے اور صرف بلند پتے رہ گئے، جس کو چھوٹی گردن والے اونٹ نہیں پہنچ سکتے تھے تو وہ سب بھوک سے فناء ہوتے اور اصلح یعنی لمبی گردن والے اونٹ رہ گئے۔ پھر ان میں توالد و

تناسل کا سلسلہ جاری رہا جس سے فناء شدہ اونٹوں کی کمی پوری ہو گئی۔

یہ ہے نظریہ ڈارون۔ جس کی بناء یہ ہے کہ بے رحم فطرت صرف قوی کو باقی رکھتی ہے اور کمزور کو مٹا دیتی ہے۔ ارتقاء کا اصلی بانی لامارک ہے۔ لیکن یورپ میں اس کا نظریہ مقبول نہ ہو سکا اور ڈارون کا نظریہ مقبول ہوا۔ اگرچہ انکارِ خدا اور مادی ارتقاء پر دونوں متفق تھے۔

وجہ یہ تھی کہ یورپ کے دورِ جدید میں کسی نظریہ کی مقبولیت معقولیت کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ ان کے جذبات کے موافقت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ چاہے وہ نظریہ کتنا ہی نامعقول ہو۔

چونکہ ڈارون کا نظریہ یورپ کے جنگجویانہ مزاج اور استعمار پرستانہ مذاق کے موافق تھا کہ کمزور کو مٹ جانا چاہیے اور صرف قوی کو تنازع للبقاء کے میدان میں رہنے کا حق ہے۔ اس لیے تمام اسکولوں اور کالجوں میں اس نظریہ نے قبولِ تام حاصل کر لیا۔

اس سے پہلے یہ بھی معلوم ہوا کہ یورپ کی فکرِ عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے۔ یورپ کی عقل کی روشنی اکثر جذبات اور مفادات کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے اور اصلی حقیقت کی طرف رسائی نہیں ہوتی۔

آیئے ہم ڈارون کے نظریہ پر تنقید کریں گے۔ جن چھ دلائل سے ہم نے لامارک کے ارتقاء کی تردید کی ہے۔ ان چھ دلائل سے ڈارونی ارتقاء کی

بھی تردید ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم ان چھ دلائل کے علاوہ اور دلائل پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ڈارون کے ارتقاء کی حقیقت معلوم ہو سکے۔

نظریۂ ڈارون کی تردید

مارکس کا معاشی نظریہ بھی ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر مبنی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ڈارون کا نظریہ ہے کہ انسان کی تمام تبدیلیاں اور تمدن کے تمام انقلابات انسان کے خارجی ماحول کے تابع ہیں اور مارکس کے نزدیک یہ ساری تبدیلیاں معاشی حالت کی تبدیلیوں کے تابع ہیں۔ دونوں کے نزدیک انسان اپنے ماحول سے مجبور ہے اور اس کا غلام اور تابع ہے اس کے اپنے ارادے کو اس میں دخل نہیں

ڈارون کا نظریہ جبر ہے

مارکس خود کہتا ہے کہ "انسان کے ارادے کی تشکیل خارجی معاشی حالات سے ہوتی ہے۔" ان دونوں کا مذہب پر یہ اعتراض ہے کہ وہ تقدیر کا قائل ہے اور وہ انسان کو عمل سے معطل کرتا ہے کہ اس نے انسانی تبدیلیوں کو انسانی میلانات اور سعی و عمل کا نتیجہ تسلیم کیا تھا۔ لیکن ڈارون نے اسے ماحول سے مجبور قرار دیا۔

۲۔۔۔ ڈارون کے نظریہ بقاء اصلح میں ظالمانہ قوتوں کی حوصلہ افزائی ہے اور مظلوم انسانوں کو بے سہارا اور بے یار و مددگار چھوڑنے کی ترغیب ہے جس سے انسان کی فطری اخلاقی رحم و شفقت علی الانسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہ دنیا میں بدامنی کی ایک تحریک ہے۔

۳۔۔۔ ڈارونی نظریۂ ارتقاء اور مارکسی نظریۂ معاشی کے مطابق انسان، بیرونی عوامل اور معاشی حالات کا ایک مجبور کھلونا بن جاتا ہے اور انسان کے ارادہ اور عمل کے لیے کوئی میدان باقی نہیں رہتا۔ وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ماحول کا محکوم بن جاتا ہے اور سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے تحت اس کو عالمی واقعات پر حاکمیت اور تسخیری قوت حاصل ہے۔ وہ فنا ہو کر اس کی ترقی اور تخلیقی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

۴۔۔۔ گذشتہ دو جنگوں نے ڈارونی اور مارکسی دونوں کے نظریات کو غلط ثابت کر دیا۔ ڈارون کا ارتقاء تو اس لیے غلط ثابت ہوا کہ گذشتہ صدی کی انسانی تعمیرات کو ان دونوں جنگوں نے بھسم کر دیا اور انسانی ارادے اور خواہشات نے ماحول کی ہر تعمیر کو خاکستر بنا کر فنا کر دیا اور ارتقاء کو انحطاط میں تبدیل کر دیا۔ اور مارکسی معاشی نظریہ کو اس لیے غلط ثابت کر دیا کہ ان دونوں جنگوں میں زیادہ نقصان مزدوروں کو پہنچا جو شہر کے کارخانوں میں کام کر رہے اور بمباری زیادہ تر شہروں پر ہوئی۔ اور ان جنگوں سے غریبوں کی غربت اور افلاس میں اضافہ ہوا۔

اقوام متحدہ کی سماجی و معاشی رپورٹ مندرجہ انجام کراچی ۱۰ مئی ۱۹۵۳ء میں درج ہے کہ:۔

"دنیا کی نصف آبادی فاقہ کشی اور بیماری میں مبتلا ہے۔"

۵۔ ارتقاء کے متعلق جارج برنارڈ شا لکھتا ہے۔

"کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ جس شخص نے انسانیت کے سامنے یاس و ناامیدی کی ایسی ہیبت ناک خلیج کھول دی، وہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ہے، جس میں بھوک، موت، حماقت، ابلہی اتفاقات اور اسی نوع کی دیگر کورانہ قوتیں کام کر رہی ہیں۔

حیرت ہے کہ نہ تو اسے سنگسار کیا گیا۔ نہ انسانی نسل سے اس کی دشمنی پر اسے پھانسی دی گئی بلکہ الٹا اس کو دنیا کا نجات دہندہ اور ایک نئے عہد کا پیغمبر مانا گیا۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ:۔

ڈارون کا نظریہ اس لیے مقبول ہوا کہ ہر جماعت ایک قسم کی اغراض رکھتی تھی۔ یہ نظریہ ان اغراض کا موید تھا۔ جنگ کے حامیوں سے لے کر اشتراکیت پسندوں اور سرمایہ داروں تک نے اس کو پسند کیا۔ جنگ پسند اور سرمایہ داروں نے اس لیے پسند کیا کہ اس میں تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کا تصور پیش کیا گیا اور اس نظریہ کی رو سے کمزوروں کو شکست اور بربادی اور طاقتور کی فتح مندی کو فطرت کا ایک ازلی قانون بتایا گیا اور "بنی آدم اعضاء یک دیگر اند" کا توڑ اس میں موجود تھا۔ اشتراکیوں نے اپنے نظام کو بقاءِ اصلح سمجھا۔"

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ فکرِ جدید والوں کی لغزشیں تمدنی مسائل کے حل میں کس قدر خطرناک ہے۔

تمدنی مسائل کے حل میں انسانی فکر کی حماقت

پروفیسر لاسکی لکھتے ہیں:۔

"ہم اپنے شخصی تجربات کی چار دیواری میں اس طرح محصور ہیں کہ غیر شعوری طور سے اپنی ذاتی بصیرت کو معیارِ حق قرار دیتے ہیں۔ سماجی انقلابات کی آدھی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ اگر ہم اس یقین سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ہماری ذاتی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی معلومات میں علت و معلول کی بابت سائنٹفک زاویہ نگاہ حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا عالمِ طبیعی میں اس کا حصول آسان ہے۔ کیونکہ اول الذکر کے متعلق ہماری رائے اور فیصلے میں وہ سارے جذبات و تعصّبات دخیل ہو جاتے ہیں جن سے نجات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ جذبات و تعصبات ان مفروضات اور اصول لے موضوعہ کے انتخاب میں ہماری نظر کو متاثر کرتے ہیں۔ جن پر ہم

اپنے نتائج کی بنیاد رکھتے ہیں۔ طبیعیات اور کیمیا۔ یہیں تو ہماری عقل ناطرف دار اور انصاف پسند رہتی ہے۔ لیکن اضافی امور اور معاملات میں اس ناطرف داری اور انصاف کا دسواں حصّہ بھی باقی نہیں رہتا۔" (اشتراکیت اور اسلام۔ صدیقی ص۲۹۸ تا ص۳۰۰)

ماوراء الطبیعات اور نہایت لطیف حقائق کے متعلق فکرِ جدید کی نارسائی

گذشتہ تحریرات سے یہ ثابت ہوا کہ انسان محسوس اور غیر لطیف ہونے کے باوجود فکرِ جدید کو ان کے معاملات میں حقیقت تک رسائی نہ ہو سکی اور غلط افکار کی وجہ سے انسانیت کو مبتلائے مصائب کر دیا جو ہدایات ربانی سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

اب ماوراء الطبیعات مثلاً خدا، ملائکہ، رسالت، آخرت، رُوحِ انسانی کے مسائل کے متعلق اس کی بے چارگی تو انسانیات کے مسائل کی نسبت زیادہ واضح اور نمایاں ہیں اور انسان اس سلسلے میں صرف ہدایاتِ ربانی اور الہاماتِ خدائی کا محتاج ہے۔

جن فلاسفۂ مغرب نے خدا اور مذکورہ دینی حقائق سے انکار کیا۔ جیسے رابرٹ رنگرسال اس انکار کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ہم ان اشیاء

کو نہیں جانتے۔ گویا لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ نہ یہ کہ ان دینی حقائق کا نہ ہونا ان کو معلوم ہے۔

۱۔ الکلام میں فیلل فلاریان فرانسیسی کا یہ قول منقول ہے کہ:۔

"تمام فلاسفۂ مغرب اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر متحقق ہوا اور اس نے کیونکر ترقی کی۔ لہٰذا ہم اس پر مجبور ہیں کہ ایک ازلی ابدی خالق کا اقرار کریں۔"

۲۔ فونسل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مقصد الطبیعات فہم خالق ہے اور اس بات میں کوئی شک کہ اللہ اور خالق کائنات کا وجود بدیہی ہے۔"

۳۔ پلوٹارک ایزک نیوٹن کہتا ہے کہ:۔

"عالم کی موجودہ ترتیب ایک خدائے علیم و قدیر کے بغیر ناممکن ہے۔"

۴۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ:۔

"یہ ضروری ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی ابدی قوتِ خداوندی موجود ہے۔"

باقی امور کا علم بھی فکرِ جدید کے دائرے سے اس لیے خارج ہے کہ انسان کے محسوس کیفیات اور معاملات سے جب فکرِ جدید قاصر ہے اس لیے کہ

وہ مادی تجربے کے دائرے سے خارج ہیں تو ملائکہ، نبوت، رُوحِ انسانی، آخرت حسن، قبیح، اعمالِ انسانی تک ان کی رسائی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔

انسانی اعمال کے متعلق پارلیمنٹوں میں مفکرینِ جدید کے فیصلے روز بدلتے ہیں۔ کبھی آزادیٔ تجارت کا قانون پاس ہوتا ہے۔ جب اس میں خامی نظر آتی ہے تو پابندی لگا دیتے ہیں۔ کبھی شراب نوشی کی آزادی کا قانون بنتا ہے۔ لیکن جب شراب کی مضرتیں نمایاں ہوئیں تو ۱۹۳۰ء میں امریکہ نے بندشِ شراب کے قانون کو نافذ کرنا چاہا۔ لیکن شراب کے عادی عوام کے آگے ان کی بات نہ چل سکی۔ کبھی طلاق کی بندش کا قانون پاس کیا گیا اور اسلام پر قانونِ جوازِ طلاق کی وجہ سے انکار کرتے رہتے۔ لیکن جب ازدواجی حالات نے ان کو مجبور کیا تو جوازِ طلاق کا قانون پاس کیا گیا۔

اسی طرح انسانی معاملات کے متعلق روز قوانین بنتے ہیں اور تجربہ کے بعد توڑے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علم الحیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر لائیڈ مارگن نے لکھا ہے کہ:۔

"انسانی ارتقاء کی توجیہ ممکن نہیں تاوقتیکہ اصل تخلیقی یعنے خالقِ کائنات کا اقرار نہ کیا جائے۔" اگر ارتقاء طبعی بھی ہو تو سوال یہ ہوگا کہ ارتقاء کا تقاضا کہاں سے آیا۔ پھر ارتقاء ایک سیڑھی ہے۔ اور ہر سیڑھی پر چڑھنے کے لیے ایک منزلِ مقصود کا ہونا ضروری

ہے۔ کیونکہ ارتقاء سیڑھی کی طرح بالذات مقصود نہیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے مقصود ہے جو ذات رب العالمین ہے۔

علم الطبیعیات کی مشکلات کا حل علم الحیات میں ہوتا ہے اور علم الحیات کے غوامض کا حل علم النفسیات میں اور علم النفسیات کے دقائق کا حل علم التعلیل والتحلیل المنطقی میں اور پھر علم التعلیل کے غوامض کا حل مقامِ روحانیات اور الہامات الٰہیہ میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دو سو سال میں فکرِ جدید نے مادہ کے متعلق جو طے کیا تھا۔ اس کو جدید دریافت نے توڑ دیا کہ مادہ سالمات اور ایٹم نہیں بلکہ برق پارے ہیں۔ اس کے بعد یہ دریافت ہوا کہ مادہ برق پارے نہیں بلکہ صرف قوت کا نام ہے جس کو صحیح تعبیر نور ہے تو معاملہ خارجیت اور جزئیت سے ذہنیت اور کلیت تک پہنچا۔" (غبارِ خاطر ص ۱۴۹)

عقل کی راہنمائی کے لیے وحی کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ علم الطبیعیات اور محسوسات کے لیے جس طرح دو قسم کی روشنیوں کی ضرورت ہے۔ ایک داخلی روشنی جو آنکھ میں ہے اور ایک خارجی روشنی جو انسانی وجود سے باہر ہے جو عالمِ بالا سے تعلق رکھتی ہے۔

اگر آدمی اندھا ہو تو بھی محسوسات مادیات اور طبیعیاتی تجربات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تاوقتیکہ اس کی آنکھ میں روشنی موجود نہ ہو۔ لیکن اس روشنی کے باوجود اگر سماوی روشنی مثلاً سورج یا اس کا قائمقام بجلی وغیرہ جس کا وجود بھی دراصل سماوی اور قدرتی ہے موجود نہ ہو۔ تب بھی مادی نظریات کی دریافت ممکن نہیں۔

اسی طرح انسانیات ماوراء الطبیعیات امور مثلاً خدا، نبوت، ملائکہ، آخرت، مجازاۃ اعمال انسانی اعمال کے حسن و قبح اور اس کے دنیوی اور اخروی نتائج و آثار کے علم کے لیے بھی دو نور اور روشنیاں ضروری ہیں۔ داخلی جو عقل خداداد ہے اور دوم خارجی روشنی جو وحی و الہام ربانی ہے تاکہ عقل وحی کی روشنی میں لطیف اور غیر مادی حقائق کو دریافت کر سکے۔

مادیات کم درجے کی چیزیں ہیں۔ ان کے لیے جب دو روشنیوں کا انتظام فطرت کی طرف سے کر دیا گیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ ماوراء الطبیعیات کے لئے جو مادیات سے زیادہ پوشیدہ غامض اور مشکل حقائق ہیں۔ ان کے لیے عقل کے علاوہ خارجی روشنی یعنی وحی کی روشنی کے ذریعہ انتظام نہ کیا گیا ہو۔ یہ انتظام سلسلۂ وحی و انبیاء سے کیا گیا اور آخری جامع اور اکمل روشنی وحی قرآنی کی شکل میں ابد تک کے لئے محفوظ کر دی گئی۔ بقول اقبال مرحوم

آں کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
صد جہاں تازہ در آیات اوست — عصرہا پیچیدہ در آنات اوست

مغربی افکار اور تہذیب کا نو آزاد اسلامی ممالک میں فاتحانہ داخلہ

ترکی

مغربی تہذیب اور افکار کے فاتحانہ داخلے کا آغاز ترکی سے ہوا۔ اور کمال اتاترک اور ان کے رفقاء نے اس کو پروان چڑھایا جس کی وجہ سے ترک، صورت و سیرت عورتوں کی آزادی، طریق لباس و خوراک، افکار و تصورات میں یورپین بن گئے اور تقریباً اپنے ماضی کی ثقافت اور تاریخ اور علمی ذخیروں سے جو عربی رسم الخط میں تھے بالکل کٹ گئے۔ اس کے بعد مصر کی نوبت آئی۔

مصر

مصر مشرق و مغرب کی تعلیمات اور ثقافت کا نقطۂ اتصال ہے۔ وہ اپنی خصوصیات اور جامع ازہر اور وسیع ذرائع نشر و اشاعت کی وجہ سے واحد اسلامی ملک ہے جو ظاہری نہر سویز جو مشرق و مغرب کا ظاہری نقطۂ اتصال تھا، کا مالک ہے۔ وہ ایک دوسری تعلیمی اور فکری نہر سویز بنانے کے قابل تھا، جس کی ضرورت مشرق اور مغرب کو ظاہری نہر سویز سے بہت زیادہ تھی اور دونوں میں اسی باطنی نہر سویز سے توازن قائم

ہو سکتا تھا اور ظاہری نہرِ سویز کے ذریعہ تبادلۂ اموال سے زیادہ باطنی نہرِ سویز کے ذریعہ تبادلۂ علوم کی ضرورت زیادہ تھی۔

یہ باطنی نہرِ سویز مشرق کو جو طبعی و صنعتی علوم میں پسماندہ ہے اس مغرب سے جو ترقی یافتہ ہونے کے باوجود سرگشتہ و حیران اور اخلاق و روحانیت میں تہی دامن اور مایوس اور بدگمانی اور خودکشی کی راہ پر گامزن ہے، اسلام سے ہمکنار کرتی ہے اور تمام اسلامی ممالک کے لیے ایک ایسا نمونہ قائم کرتی کہ ایک طرف مسلمان ممالک طبعی و صنعتی علوم میں یورپی ممالک کے ہمسر ہوتے اور دوسری طرف ایمان و یقین کے جذبات سے اور پاکیزہ کردار سے آراستہ ہوتے لیکن یورپ کے ملحدانہ تعلیم کی آتشِ نمرود سے بچ کر نکلنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے ابراہیمی یقین کی ضرورت تھی۔

تعجب ہے کہ عرب جو ایمانی یقین اور تہذیب کا مرکز ہے اور عجم جو اس مرکز سے دور ہے۔ پھر بھی عجم نے جمال الدین افغانی، اقبال اور محمد علی جوہر کو پیدا کیا۔ لیکن عرب میں کوئی ناقد پیدا نہ ہوا بلکہ جتنے عرب افراد مغرب کی تعلیم گاہوں سے نکلے۔ وہ مغرب کے ایک شاگرد اور مقلد اور خوشہ چین اور احساسِ کمتری میں ڈوبے ہوئے نکلے۔

لہٰذا نہرِ سویز علمی کی امید ان سے پوری نہ ہو سکی۔ لیکن مغربی تہذیب اور افکار کے آگے عملاً اس نے اپنی شکست تسلیم کی۔ جس کی تصدیق ڈاکٹر طٰہٰ

حسین جو مصرِ جدید کی ذہنیت کا ترجمان اور اخبار "الاہرام" کا ایڈیٹر ہے۔ اپنی کتاب "مستقبل الثقافت فی مصر" ص۳۲ پر لکھتے ہیں:۔

"ہماری معنوی زندگی اپنے مظاہر کے اختلاف کے ساتھ خالص مغربی ہے۔ ہمارا نظام حکومت خالص مغربی ہے۔ ہم نے اس کو یورپ سے بغیر کسی تردد کے جوں کا توں منتقل کیا۔ اگر ہم اپنے کو کچھ ملامت کر سکتے ہیں تو صرف یہ کہ ہم نے اہل یورپ سے ان نظاموں اور سیاسی زندگی کی شکلوں کو منتقل کرنے میں سستی اور تاخیر سے کام لیا۔"

ص۳۱ پر لکھتے ہیں:۔

"ایک مصری کی دنیاوی اور مادی زندگی کے لیے اعلیٰ نمونہ (آئیڈیل) وہی ہے جو ایک مغربی کی مادی زندگی کا ہے۔"

ص۴۱ پر لکھتے ہیں:۔

"ہمیں اہل یورپ کے طریقے پر چلنا چاہیے اور ان کی سیرت و عادات کو اختیار کرنا چاہیے" تاکہ ہم ان کے برابر ہو سکیں اور تہذیب کے خیر و شر، تلخ و شیریں، پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر چیز میں ان کے رفیق کار اور شریکِ حال ہو سکیں۔"

یہ اس طٰہٰ حسین کا حال ہے جو اس وقت حکومتِ مصر کی زبان ہے اور

۱۹۴۹ء میں وزیرِ تعلیم مصر رہ چکے ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں بصارت سے محروم ہو گئے۔ مکتب میں قرآن حفظ کیا۔ کچھ عرصہ ان میں رہے۔ جامعہ مصریہ میں تعلیم مکمل کی۔ پیرس سے ڈاکٹریٹ کیا۔ بیوی ان کی فرانسیسی ہے۔ ناصر المیثاق الوطنی باب اول نظرۃ عامۃ میں لکھتے ہیں:۔

"ایسی سوسائٹی جو حریت، سوشلزم اور اتحاد کو زندگی کی اساس اور جدوجہد کے اعلیٰ مقاصد تعین کرتی ہو۔"

اور قومی منشور کے باب سوم میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مصری جدوجہد کی جڑوں کو فرعونی تاریخ میں تلاش کرے جو مصری اور انسانی تہذیب کے اولین بانی ہے۔ اس مصری انقلاب کا عالم عربی پر جو اثر ہوا وہ یہ ہے۔"

شام و عراق

یہ دونوں ملک اسلامی علوم اور ثقافت کے مرکز رہے ہیں۔ شام میں مسلمانوں کی آبادی نوّے (۹۰) فی صد اور عراق میں ترانوے (۹۳) فی صد ہے۔ شام میں اس وقت البعث پارٹی کی حکومت جس کا بانی ایک عیسائی میشیل عفلق ہے۔ یہ پارٹی اپنے منشور[۴] میں لکھتی ہے:۔

"حزب البعث ایک اشتراکی جماعت ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ اشتراکیت جو عرب قومیت کے باطن سے پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ بہترین نظام ہے جو عرب کی صلاحیتوں کا سامان ہے۔"

فقط دونوں ملکوں میں عورتوں کی بے پردگی، مرد عورتوں کا اختلاط، مخلوط تعلیم کا عام رواج ہے۔ مذہب بیزار اور لادین عناصر زندگی پہ حاوی ہیں دونوں حکومتیں عرب نیشنلزم اور سیکولرازم ہیں۔"

ایران

رضا شاہ نے ملک کو تعلیمی اور معاشرتی میدانوں میں عصرِ جدید کے مطابق اور ماڈرن بنانے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے فرانس کا عدالتی نظام اور قانون نافذ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں برقعہ ممنوع قرار پایا۔ اسی سال ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کیا۔ اور زمیندار کی تنسیخ اور مالکانِ اراضی کے حقوق ملکیت ختم کر دیے گئے (اسلام اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۳۶)

البتہ یہ تصریح کی گئی ہے کہ:۔

"ایران کا سرکاری مذہب اسلام ہے اور پارلیمنٹ کو ایسے قانون بنانے کا اختیار نہیں جو اسلام کے اصول کے خلاف ہو۔"

انڈونیشیا

انڈونیشیا کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمان ہے۔ اس نے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۰ء کے دستور میں اعلان کیا کہ:۔

"اس ریاست کی بنیاد خدا کا یقین ہے اور صدرِ جمہوریہ سے لے کر ایک ادنیٰ سرکاری ملازم کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں۔ سرکاری ملازم کے لیے ضروری ہے کہ وہ وفاداری کے لیے

خدا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی قسم کھائے۔"

امریکی مبصر لوئی فتر نے اس میں حضور کے نام کو غلط پیش کیا کہ غیرِ خدا کے نام پر اسلام میں قسم جائز نہیں۔ غیر اسلامی اور غیرِ مذہبی حکومت کی اکثر آبادی نے مخالفت کی۔ لیکن اربابِ اقتدار، تہذیبِ مغربی کے دلدادہ تھے اور وہی زندگی پر حاوی تھے۔ اس لیے مذہبی انقلاب نہ آسکا۔

تیونس

تیونس ۱۹۵۶ء میں آزاد ہوا۔ آزادی کے صدر حبیب بورقیبہ نے ترکی کے نقشِ قدم پر چل کر فرانسیسی ثقافت میں ملک کو ڈھالنا شروع کیا۔ تعدادِ ازدواج کی آزادی کو مقید کیا۔ شوہر کے طلاق دینے پر پابندی لگادی۔ عورتوں کو مجالسِ قانون ساز میں ممبر بننے اور ملازمتوں میں حصہ لینے کی آزادی مل گئی۔ اس وقت سو خواتین محکمہ تعلیم میں، ڈیڑھ ہزار دفاتر میں اور سات ہزار مختلف منصوبوں میں ملازم ہیں۔

صدر بورقیبہ کہتے ہیں کہ:۔

"میری اصلاحات اگرچہ قرآن مجید کی نصوص کی پابند نہیں لیکن وہ ان کی روح کی منافی بھی نہیں۔"

جس طرح مصر نے جامعہ ازہر کو باقی رکھا، اسی طرح تیونس نے جامعہ زیتونہ کو باقی رکھا۔ پروفیسر شاخت ایک جدید مقالہ جدید اسلامی قانون کے مسائل میں تیونس کے متعلق لکھتے ہیں:۔